خلیل جبران کے عظیم افسانے

حصہ اول

Presented by: SAMI

ماں

دنیائے فردوس کے پر مسرت ترانوں میں وہ کشش نہیں اور نہ بربط شیریں سے نکلے ہوئے پر فضا نغموں میں وہ شیرینی ہے پہاڑی جھرنوں کی سہانی آواز ایسی مسرور کن نہیں اور نہ ہی سمندری ہواؤں کے جلترنگ میں وہ لطافت ہے۔

ماہ چہاردہم کی تابانی اس قدر پر کیف نہیں اور نہ ہی حسین پھولوں کے حسن میں اس قدر دل کشی ہے۔

کائنات کی دلفریبیاں اس پیارے نام کا مقابلہ نہیں کرسکتیں۔ اس کے تمام افسوں، ماں کے مقدس تبسم کے آگے ہیچ ہیں اس ذرہ ناچیز کی طرح! جو مہر عالم تاب کا مقابلہ کرنے سے معذور ہے۔

دنیا کی تمام مسرتیں اس ایک لفظ میں مجمع ہیں اور تمام لطافتیں اسی میں پوشیدہ! دہر کی تمام خوبیوں کا مجموعہ یہی مقدس ترین ہستی ہے اور محفل حیات کی آرائش جس کا وجود اس شیریں راگ سے کم نہیں جو سنسان اور تاریک راتوں میں سب کو متوجہ کر لیتا ہے۔ ازسرنو تازگی حیات عطا کرتا ہے۔

ماں ایک نعمت ہے نایاب نعمت! اس کا نعم البدل ناممکن ہے۔ قطعی ناممکن! زمین کی گہرائیاں اس جواہر کو اگلنے کے ناقابل ہیں اور آسمان ایسا فرشتہ رحمت بھیجنے سے قاصر۔

خوش نصیب ہیں وہ ہستیاں! جو اس بے بہا نعمت سے مالا مال ہیں جن کے سروں پر ماں کا مقدس سایہ ہے اور اس کے میٹھے سانسوں میں پوشیدہ جنت۔

اور اس بدنصیب کا کیا ذکر جو اس مخزن لطف و کرم سے محروم ہے جس کی بہار حیات پر وقت سے پہلے ہی خزاں نے غلبہ پالیا۔

☆☆☆☆☆

خوابوں کے جزیرے

سحر کے ملگجے اور دھندلے سے میں ہوا شور مچا رہی ہے اس کے لطیف جھونکوں سے پھولوں کی پتیوں پر سے شبنم کے قطرے اس طرح گرتے ہیں جیسے نوگرفتار عروس سحر کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے ہوں جو کائنات کی تجدید حیات ہیں اور دہر کی شادابی کا باعث۔

درختوں کی آڑ سے آفتاب طلوع ہو رہا ہے اس کی دھندلی کرنوں نے تعاقب تاریکی شروع کر دیا جیسے گناہگاری کے اہرمن کے پیچھے آسمانی فرشتے بھاگ رہے ہوں اس کے ناپاک وجود سے کائنات کو پاک کرنے میں کوشاں ہوں۔

سنہرے اور قرمزی بادل آسمان پر لہرا رہے ہیں وسیع خلاؤں میں بار بار چکر کاٹتے ہیں جیسے مقدس روحیں مصروف گلگشت چمن ہوں فضائے لامحدود میں اڑ کر جو بار نور پھیلا رہی ہو۔

غنچے کھل کھل کر پھول بن رہے ہیں ان کی تیز اور سہانی خوشبو دور دور تک مہک رہی ہے۔ جیسے کوئی جل پری مشکیں لباس میں ملبوس ہواؤں میں اڑ رہی ہو سب کو مدہوش اور سرشار کر رہی ہو۔

☆☆☆☆☆

جستجوئے سکوں

میری تھکی ہوئی روح متلاشی سکون ہے اور تنگ آیا ہوا دل اطمینان کا متجسس۔

جب نسیم سحر شرمیلی سرسراہٹ سے غنچوں میں سے گزرتی ہے تو نہ معلوم لجہ سرگوشی میں ان سے کیا کہہ دیتی ہے کہ وہ فرط مسرت سے کھلکھلا اٹھتے ہیں ایک انداز بے خودی میں تالیاں بجانے لگتے ہیں؟

اللہ! مجھے تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ شاید نسیم سحر نے ان سے کوئی راز کہہ دیا ہے۔ انہیں محسوس ہوتا ہے کہ شاید نسیم سحر نے ان سے کوئی راز کہہ دیا ہے۔ انہیں امن و سکون کا پتہ بتا دیا ہے۔

لیکن جب یہی غنچے پھول بن جاتے ہیں حد سے زیادہ کھل کر فضا میں منتشر ہو جاتے ہیں تو میری مایوسی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہتا آہ! دل بےقرار و تشنہ سکون!

سمندری لہریں اک عالم بے نیازی میں آگے بڑھتی ہیں گردوپیش سے بے خبر قہقہے لگاتی ہوئی آگے جاتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ آشنائے سکون ہیں اور بہر اندوز راحت قلبی۔

لیکن معبود! جب وہ ساحل سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی ہیں ایک مشت خاک اور سمندری جھاگ میں تبدیل ہو جاتی ہیں تو مجبوراً مجھے اپنی رائے بدلنی پڑتی ہے آہ! وہ تو جان شیریں دے کر بھی سکون قلبی نہ پا سکیں۔ دم واپسیں بھی تو انہیں طمانیت نہ نصیب ہو سکی۔

روشن اور چاندی راتوں میں جب چاند آہستہ آہستہ راستے طے کرتا ہے جیسے ملکہ فطرت آسمانی فضاؤں کی سیر کر رہی ہو۔ روح کی طرح مبارک اور نغمے کی طرح معصوم ماہ پوری شوخی پر ہوتا ہے اور تا حد امکان مسرور و خندہ زن۔

گویا سکون قلب سے مالا مال ہے اور لطف حیات سے پوری طرح بہر اندوز لیکن ای سے! آہ ای لمحے! اک لکہ ابر اسے نگاہوں سے پوشیدہ کر دیتا ہے اور خلائے

آسمان میں نہاں۔

چاند کی تابانی غائب ہو جاتی ہے اور باندنی مفقود از نظر اس وقت میری ناکامی کی انتہا نہیں رہتی! مالک!

ماہ منور بھی تو سکون قلب سے محروم ہے۔

ارغوانی آسمان پر ستارے جگمگاتے رہتے ہیں طلوع آفتاب کی زریں کرنیں احاطہ کائنات گھیر لیتی ہیں اور روپہلی و قرمزی بادل صفحہ آسمان پر اس طرح اڑتے پھرتے ہیں جیسے سفید پروں والے فرشتے مصروف خرام ہوں۔

مگر آہ! میرا مایوس دل! وہ تو اب بھی تشنہ ہے اور طمانیت کی پھوار کے لئے بے قرار! جیسے پرسکوت ساز کے سینے میں نغمہ لرز رہا ہو۔

تو مالک! تیری اس وسیع کائنات میں کہیں سکون کا وجود بھی ہے یا نہیں؟

میری روح اس کی جستجو میں خیاباں کے چکر کاٹ رہی ہے دل مضطر حد سے زیادہ مضطرب ہے اور بے چین۔

☆☆☆☆☆

لمحہ نشاط آگیں

وہ پر کیف و روح پرور لمحہ!

خزاں کے دھندلے آسماں پر ستارے رقص کر رہے تھے۔ چاند بادلوں سے آنکھ مچولی کھیل رہا تھا اور ہوا شرمیلی سرسراہٹ سے درختوں میں چھپی ہوئی چل رہی تھی جیسے کوئی معصوم چل پری جھجک جھجک کر آگے بڑھ رہی ہو۔

اف! وہ لمحہ کیف انگیز! جو خواب کی طرح خوش گوار تھا اور موسیقی جیسا لطیف، جھیل کے ساکت پانی پر چاندی ناچ رہی تھی۔ نیند کا فرشتہ اپنے سفید پر پھیلائے ہوئے تھا اور ہر چہار طرف ہلکی ہلکی مدہوشی چھا رہی تھی۔

جیسے کسی خواب آور نغمے کے زیر اثر کائنات بے خود ہو اور سرشار۔

وہ لمحہ نشاط انگیز! جو تبسم جیسا خوبصورت تھا اور برق جیسا حسین! جھاڑیوں میں کہیں کہیں جگنو چمک رہے تھے دور یام کے درختوں سے کوئل بار بار کوک اٹھتی۔ اس کی آواز موسم بہار کی پھوار کی طرح روح پر چھا جاتی ہوا میں ارتعاش پیدا ہو رہا تھا اور فضا میں مسلسل لرزش۔

جیسے ننھی ننھی بوندیں آبشار میں گر کر ہلکی ہلکی لہریں بناتی ہیں۔

وہ لمحہ نشاط آگیں! جو قوش و قزح کی طرح رنگین تھا اور شفق کی طرح دلفریب!

☆☆☆☆☆

''راہبر''

میں حیات کی طویل گھاٹیوں کو عبور کر رہی تھی اس کی بے پناہ وادیوں کو طے کر رہی تھی تمہاری راہبری میں خوشی خوشی آگے بڑھتی اور سنبھل سنبھل کر چل رہی تھی۔

یہاں کے پرخطر راستے میرے لئے بے معنی کھیل تھے اور پیچیدہ شاہراہیں وجہ انبساط و سرور!

دہر کا ذرہ ذرہ میری مسرتوں کا شریک تھا۔ حسین تتلیاں اپنے سنہری پر پھڑ پھڑا کر اظہار شادمانی کرتیں اور جگمگاتے ہوئے تارے ہنس ہنس کر اپنی شادکامی کا یقین دلاتے! تمہاری معیت میں سفر حیات مجھے ایک سہانا سا خواب معلوم ہوتا تھا ایک حسین و پرکیف خواب!

لیکن اب! جب کہ حیات کا کٹھن سفر شروع ہوا یہ آبلہ پا اور بے بال و پر کر دینے والا سفر! جہاں چپے چپے پر تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ہر گام پر روح فرسا مناظر کا مشاہدہ۔

تو کسی پوشیدہ طاقت نے تمہیں مجھ سے دور کر دیا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے علیحدہ۔

اف! ایک بے کس سے اس کا آخری سہارا بھی چھوٹ گیا! اس کے سرمایہ حیات کو اس سے چھین لیا گیا۔

اب میں اکیلی ہوں، اس برگ خزاں رسیدہ کی طرح جسے بگولوں نے لق و دق صحرا میں لا پھینکا ہو اپنی تنہائی کے خیال سے متوحش ہوں اور تمہاری آمد کی منتظر کہ شاید کبھی تمہیں میری بے بسی پر رحم آ جائے اور تم اس طرف آ نکلو۔ آہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ محض خیال ہی خیال ہے۔ مجھے تمہارا انتظار ہے۔ شاید انتظار!

وہ عہد مسرت و انبساط ختم ہو چکا۔ اب نا امیدی کا حصار ہے اور ہجوم پریشانی! آہ میرا دل افسردگی کی گہرائیوں میں تیر رہا ہے میرے مشفق راہبر! عزیز ترین دوست! جب فنا کے لرزہ خیز ہاتھ مجھے ان فضاؤں میں پہنچا دیں گے جن سے میں مانوس

نہیں! جہاں کی ہر شے میرے لئے اجنبی ہوگی اور ہر ہستی بیگانہ۔ جہاں ایک مہیب سا خوف فضا میں سانس لے رہا ہوگا اور ہر طرف شب یلدا کی سی تیرگی!

کیا وہاں! اس وقت بھی تم میری مدد کو نہ آؤ گے۔ میری آخری منزل کے آخری مدد کو نہ آؤ گے۔ میری آخری سانس منزل کے آخری مددگار بن کر مجھے اپنی پناہ میں نہیں لوگے؟

کیا میرا انتظار! میرا بڑھتا ہوا انتظار! اس وقت بھی مبدل بہ مسرت ونشاط نہ ہوگا!

آہ! میرے مونس اور ہمدرد جو کچھ ہو تو اور صرف تم ہی ہو!

☆☆☆☆☆

دل کی کلی

خشک اور مرجھائے ہوئے پتوں کی جگہ بہار کی شاداب کونپلوں نے لے لی تھی۔ وہ پھول جو کبھی دل شکستہ ہو کر گر گئے تھے آج نئی نئی چمکیلی کلیوں کی شکل میں دکھائی دے رہے تھے، ہر طرف مسرت و شادمانی کا دور دورہ تھا اور رعنائی و کیف آفرینی بہار۔

ایک تختہ گلاب سے بلبل شیدا نے اپنا راگ شروع کر دیا جیسے بہار کی دیوی نغمات شادمانی گا رہی ہو وہ اپنے گزشتہ مصائب بھول چکی تھی اور دور خزاں، حرف غلطی کی طرح اس کے دل سے محو ہو گیا تھا اب وہی عندلیب خوشنوا تھی اور وہی اس کے ترانہ ہائے بہار۔

اس کے ننھے سے قلب کا مسرتوں نے حصار کر لیا تھا اور غنچے کھل کھل کر پھول بن رہے تھے۔ لیکن وہ کھلے تو تھے خواہ اک عارضی عرصہ کے لئے۔ ہی بلبل شیدا مسرور تو تھی خواہ وہ مسرت برق آسا ہی کیوں نہ تھی۔

مگر وہ محروم تمنا اور ناکام آرزو کیا کرے؟ جس کے دل حزیں کو کبھی کھلنا نصیب ہی نہ ہوا ہو جس کی قلبی گہرائیوں میں ہر وقت خزاں ہی چھائی رہتی ہے۔

جس طرح روشنی کی کرنیں تعاقب تاریکی کر کے اسے مٹا دیتی ہیں امید کی کرن میرے غم رسیدہ قلب کو بھی جگمگایا کرتی تھی۔ اپنی دنیائے تخیل میں میں مسرور تھی اور خواہشوں کے بر آنے کی غلط توقع میں شاد و شاد۔ قوس و قزح جیسی رنگین! اور صبح درخشاں جیسی سہانی تمنائیں وہ عرصہ دراز تک میرے دل میں پرورش پاتی رہیں لیکن لذت بہار سے آج تک محروم اور شرمندہ تکمیل ہونے سے معذور۔

آہ! امتداد وقت نے تو ان کے مدھم سے نقش بھی مٹا دیئے جیسے کسی مجذوب کی آواز فضا میں تھرتھرا کر غائب ہو جاتی ہے اسی طرح میری آرزوؤں نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ پھر واپس لوٹ کر نہ آنے کے لئے۔

ہر آنے والی شب ظلمت بداماں بن کر آتی ہے کسی خفتہ بخت کے نصیب کی طرح

سیاہ و تاریک میرے الم رسیدہ دل پر بھی یاس کی سیاہی چھا رہی ہے اور اس کی مرجھائی ہوئی کلی۔ آہ! اس کی تو پنکھڑیاں منتشر ہیں اور بڑھتی ہوئی ناکامیوں کی شاکی۔

اسے تو شاید زندگی کی بڑی سے بڑی فصل بہار بھی نہ کھلا سکے۔

☆☆☆☆☆

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved
2002-2006

انقلاب

بہار جو ہر سال کائنات کو رشک ارم بنا دیتی تھی آج پورے وقار سے جلوہ گر عالم ہے مع اپنی رعنائیوں اور کیف آفرینیوں کے۔

گھنی جھاڑیوں میں بلبل اس کے خیر مقدم کے ترانے گا رہی ہے کوئل کی کوک ہے اور پتوں کا رقص! ناچتا ہوا سبزہ ہے اور عالم بے خودی میں اڑتے ہوئے بادل

دنیا حسن بن صباح کی روایتی جنت سے بڑھ کر خوشنما معلوم ہوتی ہے جیسے ایک چشمہ مسرت پھوٹ پڑا ہو اور ہر تشنہ مسرت کو مدہوش و سرشار کر رہا ہو۔

لیکن مجھے تو اس کے بننے کے انداز میں کسلمندری نظر آتی ہے جیسے تمہارے دائمی مسکن پر رنج و تاسف کے چھینٹے اڑاتا بہہ رہا ہو۔

مجھے تو اس بہار میں بھی آمیزش خزاں معلوم ہوتی ہے جبھی تو بلبل کے میٹھے گیتوں میں درد کا عنصر ہے۔ کوئل کی کوک سراپا سوز ہے اور اڑتے ہوئے بادل گرفتہ۔

میرا دل جو کبھی حد سے بڑھ کر پرسکون تھا اور طمانیت قلبی سے مالا مال! آج ریت کے ذروں کی طرح پریشان ہے اور گرجتی ہوئی موجوں کی طرح بے قرار۔

آہ! تمہارے بعد تو اس کی شوریدگی بڑھتی جاتی ہے اور تڑپ ہر لحظہ بہ لحظہ افزوں تر میں ہر روز دیکھتی تھی کہ حد سے زیادہ کھلے ہوئے پھول مرجھا جاتے ہیں اور پتیاں ہوا میں اڑ جاتی ہیں فضاؤں میں منتشر ہو جاتی ہیں اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غائب از نظر۔

لیکن مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ تمہیں کھو کر میرا مسرور دل بھی یوں ہی پژمردہ ہو جائے گا۔ ریزہ ریزہ ہو جائے گا اور ہمیشہ کے لئے راحت و سکون سے محروم۔

قطرات شبنم کو گلاب کی پتیوں پر لرزاں دیکھ کر میں افسردہ ہو جاتی تھی اور شعاع آفتاب میں جذب ہوتے دیکھ کر پژمردہ!

لیکن مجھے اس بات کا خیال ہی کب تھا کہ تمہاری مقدس یاد میں مجھے بھی آنسو

بہانے پڑیں گے قطرات شبنم کی طرح تھرتھراتے آنسو! جو میری نذر عقیدت ہوں گے اور دنیائے فانی کا آخری تحفہ۔

دیوار پر کانپتے ہوئے سائے اکثر مجھے متوجہ کر لیتے تھے کہ کہیں بے قرار روح تلاش سکون میں تو نہیں بھٹک رہی غیر مرئی وادیوں کی کوئی ہستی راستہ تو نہیں بھول گئی۔

لیکن آج! میری روح بھی اسی طرح بھٹک رہی ہے تمہاری تلاش میں مسلسل چکر کاٹتی ہے اور مایوس ہو کر لوٹ آتی ہے مجبور ونا کام تمنا۔

آہ! مجھے کیا معلوم تھا کہ موت اس قدر حامل رازہائے سربستہ ہے۔ اتنی سبب مفقود سکون ہے اور ایسی وجہ انقلاب!

☆☆☆☆☆

شیطان

سمعان پادری روحانیات کی باریکیوں کا عالم تھا اور لاہوتی مسائل کا بحر بیکراں، صغیرہ و کبیرہ گناہوں کا رمز شناس اور دوزخ، اعتراف اور بہشت کے رازوں کا امین!

وہ شمالی لبنان کے ایک ایک گاؤں میں جاتا، وعظ کہتا اور لوگوں کو شیطانی پھندوں سے نکال کر ان کی ذہنی بیماریوں کا علاج کرتا۔ اس کی ان کوششوں نے شیطان کو اس کا دشمن بنا دیا اور شب و روز اس سے برسر پیکار رہنے لگا۔

دیہاتی، سمعان پادری کی بے انتہا عزت کرتے اور سونے چاندی کے عوض اس کی دعائیں اور نصیحتیں حاصل کر کے خوش ہوتے۔ ان میں سے ہر ایک پہل کرتا کہ اپنے درختوں کے بہتر سے بہتر پھل اور اپنے کھیتوں کی بہتر سے بہتر پیداوار اس کی خدمت میں پیش کرے۔

موسم خزاں کا ذکر ہے! ایک دن سمعان پادری اپنے گاؤں کی طرف جاتے ہوئے، جو ان پہاڑوں اور وادیوں میں تنہا واقع تھا، کسی ویران مقام سے گزر رہا تھا کہ سڑک کی طرف سے ایک دردناک آواز اس کے کان میں آئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا: ایک برہنہ شخص پتھروں پر پڑا تھا، اس کے سر اور سینہ کے گہرے زخموں سے جیتا جیتا خون نکل رہا تھا اور وہ التجا آمیز لہجہ میں پکار رہا تھا:

"مجھے بچاؤ! میری مدد کرو! میں مر رہا ہوں، مجھ پر رحم کھاؤ!"

سمعان پادری اس منظر سے حیرت زدہ ہو کر ٹھہر گیا۔ اور اس درد سے بے چین شخص کی طرف دیکھا۔ پھر اپنے دل میں کہنے لگا:

"یہ کوئی سنگدل ڈاکو ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کسی راہ چلتے کو لوٹنا چاہا، لیکن وہ اس پر غالب آ گیا یہ اس وقت نزع کے عالم میں ہے، اگر میری موجودگی میں مر گیا تو میں ناکردہ گناہ، خواہ مخواہ اس جرم میں پکڑا جاؤں گا"

وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا کہ مجروح نے یہ کہہ کر اسے روک لیا:

''مجھے تنہا نہ چھوڑ! تو مجھے جانتا ہے اور میں تجھے جانتا ہوں۔ اگر تو مجھے چھوڑ کر چلا گیا تو میں یقیناً مر جاؤں گا''

پادری کی رنگت پیلی پڑ گئی اور ہونٹ کانپنے لگے، اس نے خود سے کہا:

''میرا خیال ہے کہ یہ ان دیوانوں میں سے ایک دیوانہ ہے، جو جنگل جنگل بھٹکتے پھرتے ہیں۔''

اس نے اپنے خیالات کا رخ بدلا اور پھر اپنے دل سے کہنے لگا:

''اس کے زخموں کا منظر مجھے خوفزدہ کر رہا ہے۔ لیکن میں اس کے ساتھ کیا سلوک کروں؟ روحانی طبیب جسمانی بیماریوں کا علاج نہیں کر سکتا۔''

پادری نے جانے کے ارادہ سے دو چار قدم اٹھائے اور مجروح پتھر کو پگھلا دینے والی آواز میں چلایا:

''میرے قریب آ! ہم دونوں عرصہ دراز سے ایک دوسرے کے دوست ہیں، تو سمعان پادری ہے پاکباز اعظم! اور میں نہ چور ہوں، نہ دیوانہ! میرے پاس آ! اور مجھے اس ویران جنگل میں تنہا مرنے کے لئے نہ چھوڑ! میرے نزدیک آ! تاکہ میں تجھے بتاؤں میں کون ہوں؟''

سمعان پادری مجروح کے پاس گیا اور جھک کر اسے نہایت غور سے دیکھا۔ اس کے خدوخال عجیب وغریب تھے، جن سے ذہانت کے ساتھ عیاری، دل کشی کے ساتھ کراہت اور نرمی کے ساتھ خباثت نمایاں تھی۔ پادری جھجک کر پیچھے ہٹا اور چلایا:

''تو کون ہے؟''

مجروح نے دھیمی آواز میں کہا:

''مقدس باپ! خوف نہ کھا! ہم دونوں بہت پرانے دوست ہیں۔ مجھے اٹھا اور کسی قریبی نہر پر لے جا کر اپنے رومال سے میرے زخم دھو دے۔''

پادری نے بلند آواز میں کہا:

''مجھے بتا کہ تو کون ہے؟ میں تجھے نہیں جانتا اور نہ مجھے یہ یاد پڑتا ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں تجھے کبھی دیکھا ہے!''

مجروح نے جواب دیا، اس طرح کہ موت کی خرخراہٹ اس کی آواز میں شامل تھی۔

''تو جانتا ہے کہ میں کون ہوں؟ تو مجھ سے ہزاروں دفعہ ملا ہے اور ہر جگہ تو نے میری صورت دیکھی ہے۔ میں مخلوق میں سب سے زیادہ تجھ سے قریب ہوں بلکہ میں تجھے تیری زندگی سے زیادہ عزیز ہوں۔''

پادری نے چلاتے ہوئے کہا:

''تو جھوٹا اور فریبی ہے، حالانکہ مرنے والے کو سچ بولنا چاہئے! میں نے اپنی زندگی میں کبھی تیری صورت نہیں دیکھی بتا! تو کون ہے؟ ورنہ میں تجھے چھوڑ کر چلا جاؤں گا اور تو، خون بہتے بہتے، مر جائے گا۔''

مجروح نے قدرے حرکت کی اور پادری کی آنکھوں کو نہایت غور سے دیکھنے لگا۔ اس کے لبوں پر معنی خیز تبسم نمودار ہوا اور اس نے نرم، شیریں اور گہری آواز میں کہا:

''میں شیطان ہوں!''

پادری نے ایک ہولناک چیخ ماری، جس سے وادی کا ذرہ ذرہ لرز اٹھا پھر اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ اس فیصلہ کی روشنی میں، جو گاؤں کے کلیسا کی دیواروں پر لٹکا ہوا تھا، اس نے دیکھا کہ مجروح کا جسم اپنی ترکیب اور آثار کی بنا پر ابلیسی ہیئت پر منطبق ہوتا ہے۔ کانپتے ہوئے چلایا:

''اللہ نے مجھے تیری جہنمی صورت اس لئے دکھائی ہے کہ میرے دل میں تیری طرف سے کراہت اور بڑھ جائے۔ تجھے ابدالآباد تک مردود و ملعون ہی رہنا چاہئے!''

شیطان نے کہا:

''مقدس باپ! جلد بازی سے کام نہ لے اور بے ہودہ گفتگو میں وقت ضائع نہ کر! میرے قریب آ اور اس سے پہلے کہ میری زندگی، خون کی شکل میں، میرے جسم سے بہہ جائے، میرے زخموں پر مرہم رکھ!''

پادری نے جواب دیا:

''وہ ہاتھ، جو روزانہ خداوندی قربانیوں کے لئے اٹھتا ہے تیرے جہنمی شراروں سے بنے ہوئے جسم کو نہیں چھو سکتا۔ تو زمانہ کا دشمن اور انسانیت کی بربادی کے درپے ہے، اس لئے تجھے مرنا ہی چاہئے، اس حالت میں کہ زمانہ کی زبانیں تجھ پر لعنت بھیجیں اور دنیا کے ہونٹ تجھے ملامت کریں۔''

بے چین ہو کر شیطان نے کہا:

''تو نہیں جانتا کہ کیا کہہ رہا ہے؟ اور تجھے نہیں معلوم کہ تو کس گناہ کا مرتکب ہو رہا ہے؟ سن! میں تجھے اپنی کہانی سناتا ہوں۔ آج میں ان وادیوں میں تنہا چلا جا رہا تھا۔ جب یہاں پہنچا تو کم ظرف فرشتوں کی ایک جماعت سے دوچار ہوا۔ وہ سب کے سب مجھ پر ٹوٹ پڑے اور مجھے بری طرح زخمی کر دیا۔ اگر ان میں سے ایک فرشتہ کے پاس دو دھاری تلوار نہ ہوتی، تو میں یقیناً ان سب کو مار گراتا، لیکن مسلح کے مقابلہ میں نہتا کیا کر سکتا ہے؟''

شیطان تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گیا اور اس نے اپنا ہاتھ پہلو کے ایک گہرے زخم پر رکھ لیا۔ دوبارہ اس نے کہنا شروع کیا:

''لیکن وہ مسلح فرشتہ، جس کے متعلق میرا خیال ہے کہ میکائیل تھا، بڑا پھرتیلا اور تلوار چلانے میں کمال رکھتا تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ اگر میں زمین پر نہ گر پڑتا اور میری حالت مردوں کی سی نہ ہو جاتی تو میرا ایک ایک عضو علیحدہ نظر آتا۔''

فتح مندانہ لہجہ میں پادری نے کہا:

”خدا میکائیل کا مرتبہ بلند کرے کہ اس نے انسانیت کو اس کے بدترین دشمن سے نجات دلا دی۔“

شیطان نے جواب دیا۔

”انسانیت سے میری دشمنی اس قدر اندھی نہیں ہے۔ جس قدر تیری دشمنی خود اپنی ذات سے ہے۔ تو میکائیل کو مبارک باد دے رہا ہے حالانکہ اس نے تیرے ساتھ رزمہ برابر سلوک نہیں کیا، اور بیچارگی کے عالم میں میرے نام پر لعنت بھیج رہا ہے، حالانکہ میں تیری راحت و کامرانی کا سبب تھا اور ہوں۔ کیا تو میری عنایتوں اور احسانوں سے انکار کر رہا ہے؟ ایسی حالت میں جبکہ تو میرے ہی سایہ میں پل رہا ہے! کیا یہ میرا ہی وجود نہیں ہے؟ جس نے تیرے لئے ایک پیشہ وضع کیا؟ کیا یہ میرا نام نہیں ہے، جس نے تیرے اعمال کے لئے ایک ضابطہ بنایا؟ کیا میرے ماضی نے تجھے میرے حال اور مستقبل سے بے نیاز کر دیا ہے؟ کیا تیری دولت و ثروت اس حد کو پہنچ گئی ہے کہ اب اس میں اضافہ کی مطلق گنجائش نہیں؟ کیا تو نہیں جانتا کہ تیرے بیوی بچے اور عزیز و اقارب مجھے کھو دینے سے اپنا رزق کھو دیں گے۔ بلکہ میرے مرنے سے بھوکوں مر جائیں گے؟ تو کیا کرے گا اگر مشیت مجھے فنا کر دے گی؟ کون سا پیشہ اختیار کرے گا، اگر زمانہ کی آندھیاں میرے نام کو مٹا ڈالیں گی؟ تو لوگوں کو میری پیدا کردہ مصیبتوں اور پھندوں سے بچانے کے لئے پچیس برس سے ان کوہستانہ دیہاتوں میں جھومتا پھر رہا ہے۔ اور لوگ تیرے وعظوں کو دولت اور غلہ کے عوض خرید رہے ہیں۔ بتا! اگر کل انہیں یہ معلوم ہو گیا کہ ان کا دشمن شیطان مر گیا ہے اور اب وہ اس کے پھندوں سے آزاد ہیں، تو وہ تجھ سے کیا خریدیں گے؟ اگر تیرا یہ وظیفہ، جو شیطان سے مقابلہ کرنے کے سلسلہ میں تجھے ملتا ہے، اس کے مرنے سے بند ہو گیا، تو لوگ تجھے کس بات کا وظیفہ دیں گے؟ تو کہ لاہوتی مسائل کا رمز شناس ہے، کیا نہیں جانتا کہ شیطان کا وجود ہی اس کے دشمنوں پادریوں کی تخلیق کا

سبب ہے اور یہ پرانی عداوت گویا ایک مخفی ہاتھ ہے، جو سونے چاندی کو ایمان پرستوں کی جیب سے واعظوں اور مرشدوں کی جیب میں منتقل کرتا ہے؟ تو کہ سمجھ بوجھ والا عالم ہے کیا نہیں جانتا کہ سبب کے زوال سے مسبب خود بخود زائل ہو جاتا ہے؟ پھر تو میرے مرنے سے کیوں خوش ہے؟ جبکہ میری موت تجھے اپنے مرتبہ سے گرا دے گی، تیرا رزق بند کر دے گی اور تیرے بیوی بچوں کے منہ سے روٹی کا ٹکڑا چھین لے گی۔"

شیطان ایک منٹ کے لئے خاموش ہو گیا اس کے چہرہ پر مہربانی کے بجائے استقلال کے آثار نمایاں ہوئے، اور اس نے پھر کہنا شروع کیا:

"دیکھ او مغرور جاہل! میں تجھے اس حقیقت کی تصاویر دکھاتا ہوں جس نے میری ہستی کو تیری ہستی میں ضم کر دیا ہے اور میرے وجود کو تیرے وجدان سے مربوط! آفرینش عالم کی ابتدائی ساعت میں انسان سورج کے سامنے کھڑا ہوا اور اپنا ہاتھ اٹھا کر پہلی مرتبہ بلند آواز میں کہا: "آسمان سے پرے، خدائے جلیل ہے، جو نیکی سے محبت کرتا ہے!" پھر اس نے روشنی کی طرف پیٹھ کر لی اور زمین پر اپنا سایہ پڑتے دیکھ کر چلایا "اور زمین کی تہوں میں مردود شیطان ہے، جو بدی سے خوش ہوتا ہے!" اس کے بعد وہ اپنے غار کی طرف چلا، دل ہی دل میں کہتا ہوا: "میں دو ہولناک خداؤں کے درمیان ہوں۔ ایک خدا وہ ہے، جس سے میں منسوب ہوں اور دوسرا وہ جو پہلے خدا سے برسرپیکار ہے۔ زمانہ پر زمانہ گزرتا چلا گیا، لیکن انسان دو آزاد قوتوں پر گھرا رہا۔ ایک وہ قوت، جو اس کی روح کو بلندیوں پر لے جا کر برکت دیتی ہے اور دوسری وہ قوت، جو اس کے جسم کی تاریکیوں میں گرا کر ملعون بناتی ہے۔ تاہم وہ برکت کے معنی سے واقف تھا، نہ لعنت کے مفہوم سے آشنا۔ بلکہ وہ ان دونوں قوتوں کے درمیان اس درخت کی مثال تھا، جو گرمی اور جاڑے کے درمیان ہو گرمی، جو اسے دھانی پوشاک پہناتی ہے اور جاڑا، جو اسے ننگا بوچا کر دیتا ہے۔ آخر کار جب

وہ صبح تمدن الفت بشری سے دو چار ہوا تو پہلے اس نے خاندان کی بنیاد ڈالی پھر قبلہ کی۔ اب اس کے مشاغل، میلانات کے فرق کی بناء پر، متفرق ہو گئے اور صنعتیں، مزاج و مذاق کے اخلاف کی بنا پر مختلف۔ چنانچہ ایک قبیلہ کے بعض افراد نے کھیتی باڑی کا پیشہ اختیار کر لیا اور بعض نے معماری کا۔ بعض کپڑا بننے لگے اور بعض کانیں کھودنے لگے۔ اسی قدیم زمانہ میں کہانت نمودار ہوئی اور یہ پہلا پیشہ تھا، جسے انسان نے بغیر کسی فطری ضرورت کے ایجاد کیا۔

شیطان ایک منٹ تک خاموش رہا۔ اس کے بعد اس نے ایک قہقہہ لگایا، جس سے وادی کا گوشہ گوشہ گونج اٹھا۔ اس نے کراہتے ہوئے اپنے پہلو کو ہاتھ سے دبا لیا، گویا قہقہہ نے اس کے زخموں کے منہ کھول دیئے اور سمعان پادری کو غور سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا:

''کہانت نے اس زمانہ میں جنم لیا، لیکن کس طرح؟ یہ بھی ابھی بتاتا ہوں۔ دنیا کے اس ابتدائی قبیلہ میں ایک شخص لاویس تھا میں نہیں سمجھ سکا اس نے یہ عجیب و غریب نام اپنے لئے کیوں پسند کیا تھا؟''

بہر حال وہ نہایت ذہین مگر نہایت جھوٹا اور سست آدمی تھا، جسے زراعت، معماری، گلہ بانی، شکار غرض ہر کام سے نفرت تھی، جس میں قوت بازو یا جسمانی حرکت کی ضرورت ہو اور چونکہ اس زمانہ میں بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے رزق ملنا دشوار نہیں، ناممکن تھا۔ اس لئے اس کی اکثر راتیں بھوک کی شدت سے جاگتے کٹتی تھیں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے گرمیوں کی رات تھی۔ اس قبلہ کے افراد اپنے سردار کے مکان کے گرد بیٹھے، اپنی اپنی زندگی کے واقعات دہرا رہے تھے اور اس انتظار میں تھے کہ نیند آ جائے۔ اچانک ان میں سے ایک شخص کھڑا ہوا، اور چاند کی طرف اشارہ کر کے خوفناک آواز میں چلانے لگا:

''ذرا چاند دیوتا کو تو دیکھو! اس کا چہرہ کتنا ماند پڑ گیا ہے اور روشنی کس حد تک زائل

ہو گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آسمانی گنبد میں ایک سیاہ پتھر لٹک رہا ہے۔"

لوگوں نے چاند پر اپنی نگاہیں جمائیں اور یہ دیکھ کر کہ ان کی راتوں کا دیوتا آہستہ آہستہ ایک سیاہ کرہ کی شکل اختیار کرتا جا رہا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ نہ صرف یہ کہ زمین کی رنگت بدل رہی ہے، بلکہ وادیاں اور ٹیلے بھی ایک سیاہ چادر میں چھپتے جا رہے ہیں، خوف و وحشت سے کانپنے چلانے لگے، گویا دست ظلمت نے ان کے دلوں کو دبوچ لیا ہے۔

اس وقت لادیص، جو اس سے پہلے کئی بار کسوف و خسوف کے مناظر دیکھ چکا تھا، آگے بڑھا اور لوگوں کے وسط میں جا کر ہاتھ اوپر کی طرف اٹھا دیئے۔ اس نے بلند آواز میں کہا، جس سے اس کی ذہانت، تصنع اور عیاری صاف نمایاں تھی۔

"لوگو! سجدہ کرو! سجدہ کرو اور آسمانی امداد کے لئے دعائیں مانگو! اپنی پیشانیاں زمین پر رگڑو کہ بدی کا تاریک دیوتا رات کے روشن دیوتا سے نبرد آزما ہے۔ اگر وہ غالب آ گیا تو ہم مر جائیں گے اور اگر مغلوب ہو گیا تو زندہ بچ جائیں گے۔ سجدہ کرو! دعائیں مانگو! اپنی پیشانیاں زمین پر رگڑو، بلکہ اپنی آنکھیں بند کر لو اور سجدہ سے سر نہ اٹھاؤ! اس لئے کہ اگر تم میں سے کسی نے تاریکی کے دیوتا کو روشنی کے دیوتا سے لڑتے دیکھ لیا تو وہ اپنی بصارت و بصیرت کھو دے گا اور آخر عمر تک اندھا اور پاگل ہو رہے گا۔"

لوگو! سجدہ کرو اور اپنے دلوں کی قوت سے روشنی کے دیوتا کو اس کے دشمن کے خلاف مدد پہنچاؤ۔ لادیص اسی لہجہ میں بولتا رہا۔ وہ اپنے دماغ سے نئے نئے الفاظ تراش رہا تھا، جو اس رات سے پہلے کسی نے نہیں سنے تھے۔ یہاں تک کہ آدھا گھنٹہ گزر گیا اور چاند اپنی اصلی حالت پر آ گیا۔ اب لادیص کی آواز پہلے سے زیادہ بلند ہو گئی اور اس نے مسرت و کامرانی کے لہجہ میں کہا:

"لوگو! اٹھو اور دیکھو! رات کا دیوتا اپنے شریر دشمن پر غالب آ چکا اور اب ستاروں

کی سیر میں مصروف ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ تم نے اپنی نمازوں اور دعاؤں سے رات کے دیوتا کو مدد پہنچا کر، خوش کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس وقت تم اسے زیادہ روشن اور تابناک دیکھ رہے ہو۔“

لوگوں نے سجدہ سے سر اٹھایا اور چاند کو نہایت غور سے دیکھنے لگے۔ اس کی روشن شعاعوں نے ان کے خوف و اضطرات کو مسرت اور اطمینان سے بدل دیا اور وہ مارے خوشی کے اچھلنے کودنے اور ناچنے گانے لگے۔ وہ اپنی لکڑیوں سے تانبے اور لوہے کے گھنٹے بجا رہے تھے اور وادی کی تمام فضا ان کی پرمسرت چیخ پکار سے گونج رہی تھی۔

اسی رات قبیلہ کے سردار نے لاویص کو بلایا اور کہا:

”آج کی رات تم نے وہ کام کیا ہے، جو تم سے پہلے کوئی انسان نہ کر سکا۔ تم زندگی کے ان اسرار سے واقف ہو، جو تمہارے سوا، ہم میں سے کوئی نہیں جانتا۔ خوش ہو جاؤ! کہ آج سے میرے بعد اس قبیلہ کے سب سے بڑے آدمی تم ہو۔ میں لوگوں سے اگر اپنی بہادری اور قوت کی بنا پر ممتاز ہوں تو تم اپنی عقل و فراست کے لحاظ سے ہم سب پر فوقیت رکھتے ہو۔ یہی نہیں بلکہ تم میرے اور دیوتاؤں کے درمیان ایک واسطہ ہو۔“

تم مجھے ان کی مرضی سے باخبر کرو گے، ان کے اعمال و اسرار مجھ پر ظاہر کرو گے اور مجھے مشورہ دو گے کہ میں ان کی محبت و خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کیا کروں؟

لاویص نے جواب دیا:

”دیوتا جو کچھ مجھے خواب میں بتائیں گے، میں بیداری میں حضور سے عرض کر دوں گا اور جو راز وہ مجھ پر منکشف کریں گے، میں آپ پر ظاہر کر دوں گا۔“

ہاں! میں آپ کے اور دیوتاؤں کے درمیان ایک واسطہ ہوں۔

سردار کی باچھیں کھل گئیں اور اس نے لاویص کو دو نہایت شاندار گھوڑے، سات

بچھڑے، سات بھیڑیں اور ستر بکریاں عطا فرما کر کہا:

”قبیلہ کے لوگ تمہارے لئے ایک ایسا ہی مکان تیار کر دیں گے، جیسا میرا ہے۔ اور ہر موسم کے خاتمہ پر اپنے باغوں کے پھل اور کھیتوں کی پیداوار تمہاری خدمت میں نذرانے کے طور پر پیش کریں گے۔ اس طرح تم سرداروں کی طرح نہایت عزت کی زندگی بسر کرو گے۔“

لاویس جانے کے لئے اٹھا، لیکن سردار نے یہ کہہ کر اسے ٹھہرا لیا:

”لیکن یہ دیوتا کون ہے، جسے تم بدی کا دیوتا کہتے ہو؟ کیا یہ وہی دیوتا ہے جس نے رات کو روشن دیوتا سے مقابلہ کی جرأت کی تھی؟ ہم نے اس کے متعلق کچھ بھی نہیں سنا، نہ ہمیں اس کے وجود کا علم ہے!“

لاویس نے تھوڑی دیر سر کھجانے کے بعد جواب دیا:

”پرانے زمانے میں انسان کی پیدائش سے پہلے تمام دیوتا، کہکشاں سے پرے ایک دور دراز مقام پر نہایت امن و خلوص کے ساتھ رہتے تھے۔ مہادیو، جو ان سب کا باپ تھا علم و عمل میں ان سب پر امتیاز رکھتا تھا اور اس نے اپنی ذات کے لئے بعض خداوندی اسرار محفوظ کر رکھے تھے، جو ناموس ازلی کے پردہ میں روپوش ہیں۔ چنانچہ بارھویں زمانہ کے ساتویں عہد میں بعطار نے، جو مہادیو سے نفرت کرتا تھا، بغاوت کی اور اس کے مقابلہ پر آ کر کہا:“

”تو نے ہم سے ہستی، ناموس اور زمانہ کے اسرار پوشیدہ رکھ کر مخلوقات پر اپنا مطلق اقتدار کیوں قائم کر رکھا ہے؟ کیا ہم تیری اولاد نہیں ہیں؟ اور کیا تیری قوت اور دوام میں ہماری شرکت نہیں ہے؟“

مہادیو غصہ سے کانپ اٹھا اور اس نے کہا:

”میں تمام بنیادی اسرار، مطلق اقتدار اور اولین قوت ابد الاباد تک اپنے لئے محفوظ رکھوں گا، اس لئے کہ میں ہی آغاز ہوں اور میں ہی انجام۔“

بعطار نے کہا:

”اگر تو اپنی قوت و جبروت تقسیم کرنے پر تیار نہیں تو میں اور میری اولاد تیرے خلاف علم بغاوت بلند کرتی ہے۔“

شدت غضب سے مہادیو اپنے تخت پر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے کہکشاں کی تلوار کھینچی اور دوسرے ہاتھ میں آفتاب کی ڈھال لے لی۔ پھر نہایت خوفناک آواز میں، جس سے دنیا کا ذرہ ذرہ لرز اٹھا، چلایا:

”اچھا! اگر یہ بات ہے تو اے شریر باغی! میں تجھے اس پست و ذلیل دنیا میں پھینکتا ہوں، جہاں تاریکی ہے اور بدبختی۔ جا! اور جب تک سورج راکھ کا ڈھیر اور ستارے فضا کے منتشر ذروں میں تبدیل نہ ہو جائیں، وہاں اپنی جلاوطنی کے دن، آوارگی و گم کردہ راہی میں گزار!“

اسی لمحہ بعطار دیوتاؤں کے مسکن سے، اس پست عالم میں پھینک دیا گیا، جہاں خبیث روحیں رہتی ہیں اور اس نے مہادیو کے دوامی اسرار کی قسم کھا کر فیصلہ کیا کہ وہ ابد تک اپنے باپ اور بھائیوں کے خلاف آمادہ پیکار رہے گا۔ اور ہر شخص کو گمراہ کرے گا، جو اس کے باپ سے محبت کرتا ہے یا اس کے بھائیوں کا ارادت مند ہے۔

سردار کا رنگ زرد پڑ گیا اور اس نے ماتھا سکیڑ کر کہا:

”اچھا! تو بدی کے دیوتا کا نام بعطار ہے“ لادیس نے جواب دیا۔

”اس کا نام بعطار اس وقت تھا، جب وہ دیوتاؤں کے مسکن میں رہتا تھا، لیکن اس عالم میں پھینک دیئے جانے کے بعد اس نے اپنے بہت سے نام رکھ لئے ہیں۔ مثلاً معلو بول، ابلیس، مطنائیل، بلیال، زمیال، اہرمن، مارہ، ابدون اور شیطان لیکن ان سب میں زیادہ مشہور نام شیطان ہے!

سردار نے شیطان کا نام کئی بار دہرایا۔ اس کی آواز اس طرح کانپ رہی تھی کہ

معلوم ہوتا تھا ہوا کے جھونکوں سے خشک پتوں میں سرسراہٹ پیدا ہو رہی ہے۔ اس نے پوچھا:

”لیکن شیطان تو دیوتاؤں کا مخالف ہے۔ پھر اسے انسان سے نفرت کیوں ہے؟“

لاویص نے جواباً کہا:

”شیطان اس لئے انسان کی تباہی و بربادی کے درپے ہے کہ وہ اس کے بہن بھائیوں کی اولاد ہے!“

حیرت آمیز لہجہ میں سردار نے کہا: ”اچھا تو شیطان انسان کا چچا بھی ہے اور ماموں بھی“

”تشویش و اضطراب کے عالم میں لاویص نے جواب دیا:“

”جی ہاں! لیکن وہ اس کا سب سے بڑا دشمن اور کینہ پرور نگران ہے! جو اس کے دنوں کو بدبختی اور راتوں کو خوفناک خوابوں سے گرانبار کرتا رہتا ہے۔ وہ ایک قوت ہے، جو آندھیوں کے ذریعہ انسان کے گھروں کو جڑ بنیاد سے اکھڑ پھینکتی ہے۔ قحط سالی کے ذریعہ اس کے کھیتوں کو اجاڑ دیتی ہے، وباؤں کے ذریعہ اس کے مویشیوں کو مار ڈالتی ہے اور بیماری کے ذریعہ اس کے جسم کو ناکارہ کر دیتی ہے۔ وہ ایک طاقتور لیکن بے ایمان و دغاباز دیوتا ہے، جو ہماری مصیبتوں سے خوش اور مسرتوں سے غمگین ہوتا ہے۔ اس لئے ہم پر فرض ہے کہ اس کی فطرت کے ایک ایک گوشہ کو سمجھیں، اس کی ذہانت کے ایک ایک راز سے واقف ہوں تاکہ اس کے حیلہ و شر سے محفوظ رہیں۔“

سردار نے لکڑی کا سہارا لیتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں کہا:

”اس عجیب و غریب قوت کے مخفی راز، آج میری سمجھ میں آئے جو آندھیوں کی صورت میں ہمارے گھروں کو تباہ کرتی اور وباؤں کی شکل میں ہمارے مویشیوں کو

موت کے گھاٹ اتارتی ہے۔ لاویص! مجھے یقین ہے کہ جو راز آج تو نے مجھ پر منکشف کیے ہیں، کل تمام آدمیوں پر ظاہر ہو جائیں گے اور وہ سب تیرے حضور ہدیہ عقیدت و نیاز پیش کریں گے۔ کہ تو نے انہیں، ان کے سب سے بڑے دشمن کے اسرار سے آگاہ کیا اور بتایا کہ اس کے پھندوں سے کس طرح بچا جا سکتا ہے۔"

لاویص نے سردار سے اجازت چاہی اور اپنی عقل و ذہانت سے مخمور و شادماں اپنے گھر چلا گیا، لیکن سردار اور قبیلہ کے دوسرے افراد ساری رات پریشان خوابوں اور خوفناک تصورات کی بنا پر چونکتے اور جاگتے رہے۔

مجروح شیطان تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ سمعان پادری اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت و استعجاب کا جمود تھا اور ہونٹوں پر موت کا تبسم!

شیطان نے پھر اپنے سلسلہ گفتگو کا آغاز کیا:

"کہانت نے اس طرح دنیا میں جنم لیا اور اس طرح میری ہستی اس کے ظہور کا سبب ہوئی۔ لاویص پہلا شخص تھا جس نے میری دشمنی کو باقاعدہ ایک پیشہ بنایا لاویص کی موت کے بعد، اس کی اولاد کے ذریعہ یہ پیشہ رواج پا گیا اور نشو و ارتقاء کی مختلف منزلیں طے کر کے ایک نازک اور مقدس فن بن گیا، جسے صرف وہی لوگ اختیار کر سکتے تھے، جن کی عقل تیز، روح شریف، دل پاک اور خیال وسیع ہوں! چنانچہ بابل میں لوگ اس کاہن کو سات مرتبہ سجدہ کرتے تھے، جو اپنے منتروں کے ذریعہ مجھ سے نبرد آزما ہوتا تھا۔ نینوا میں اس شخص کو، انسان اور دیوتاؤں کے درمیان ایک سنہری کڑی سمجھتے تھے، جو میرے اسرار و رموز سے واقفیت کا دعویٰ کرتا تھا۔"

شب میں اسے "چاند سورج کا بیٹا" کہتے تھے، جو مجھ سے برسرِ پیکار ہوتا تھا۔ بابل، افس اور انطاکیہ میں اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنے بیٹے اور بیٹیوں کو بھینٹ چڑھاتے تھے، جو مجھ سے خصوصیت رکھتے اور یروشلم اور رومہ

میں اپنی جانیں اس کے حوالے کر دیتے تھے، جو مجھ سے نفرت اور دوری کے اظہار میں طرح طرح کے ممالات ظاہر کرتا تھا۔ غرض یہ کہ ہر شہر میں، جو اس زمین پر آباد ہوا میرا ہی نام مذہب، علم، فن اور فلسفہ کے دائروں کا مرکز رہا۔ چنانچہ عبادت گاہیں میرے زیر سایہ قائم ہوئیں، مدارس اور تعلیم گاہوں کی بنیاد میرے مظاہر پر رکھی گئی۔ محلوں اور برجیوں نے رفعت و بزرگی میرے مرتبہ کی بلندی سے حاصل کی! میں ایک قوت ہوں، جو انسان میں عزم و ارادہ پیدا کرتی ہے۔ میں ایک تصور ہوں، جو انسان کے ہاتھوں کو حرکت میں لاتا ہے۔ میں ازلی و ابدی شیطان ہوں، ہاں! وہ شیطان جو انسان سے اس لئے مقابلہ کرتا رہتا ہے کہ وہ زندہ رہے ورنہ اگر وہ میرے مقابلہ سے بے نیاز ہو جائے تو بے شغلی اس کے افکار کو زنگ آلود کر دے گی، سستی اس کی روح کو گھن لگا دے گی اور راحت اس کے جسم کو فنا کر دے گی۔

میں ازلی ار ابدی شیطان ہوں! وہ پر جوش لیکن خاموش آندھی جو مردوں کے دماغ اور عورتوں کے سینہ میں طوفان برپا کر کے ان کی عقلوں اور دلوں کو بت خانوں اور خانقاہوں کی طرف اڑا لے جاتی ہے، تاکہ وہ مجھ سے خوف کھا کر میرے اقتدار کا لوہا مانیں، یا پھر ہوسناکی و بدکاری کے اڈوں کی طرف، تاکہ وہ میری ماضی کے آگے سر جھکا کر مجھے مسرور و شاد کام کریں۔ چنانچہ وہ پادری، جو رات کی خاموشی میں دعائیں مانگتا ہے، اس لئے کہ مجھے اپنے بستر سے دور رکھے، درحقیقت اس کسبی کی مثال ہے، جو مجھے اپنے بستر پر بلانے کے لئے گڑگڑاتی ہے۔

میں ازلی اور ابدی شیطان ہوں، جس نے بت کدوں اور خانقاہوں کی بنیاد، خوف و وحشت پر رکھی اور شراب خانوں اور چکلوں کو لذت و ہوس رانی کی اساس پر قائم کیا۔ اس لئے اگر میرا وجود فنا ہو گیا، تو دنیا سے لذت و خوف بھی فنا ہو جائیں گے۔ جانتے ہو! لذت و خوف کے فنا ہونے سے کیا ہوگا؟ یہ ہوگا کہ انسانوں کے دل کی تمام امیدیں اور آرزوئیں فنا ہو جائیں گی اور زندگی ویران و بے کیف ہو کر رہ

جائے گی، جیسے بوسیدہ سارنگی، جس کا ایک تار سلامت نہ ہو!

میں ازلی وابدی شیطان ہوں! جھوٹ، غمازی، تہمت، دغا اور مسخرگی کا خالق! اور اگر یہ چیزیں دنیا میں باقی نہ رہیں، تو انسانی جماعت اس اجاڑ باغ کی مثال ہو جائے گی، جس میں فضیات کے کانٹوں کے سوا کوئی چیز نہ اگے۔

میں ازلی و ابدی شیطان ہوں! گناہوں کا سرچشمہ! اور اگر گناہ مٹ جائیں، تو اس سے مقابلہ کرنے والے بھی مٹ جائیں گے اور ان کے ساتھ تو، تیری اولاد، تیرے پیروکار اور عقیدت مند بھی، ہاں! میں گناہوں کا سرچشمہ ہوں! تو کیا تو یہ چاہتا ہے کہ میرے مٹنے سے گناہ بھی مٹ جائے؟ کیا تو یہ چاہتا ہے کہ میرے دل کی دھڑکنوں کے ساتھ انسانی حرکت بھی رک جائے؟ کیا تو یہ چاہتا ہے کہ سبب کے ساتھ مسبب بھی زائل ہو جائے؟ کیا تو یہ چاہتا ہے کہ میں، جو دنیا کی چہل پہل کا بنیادی سبب ہوں، اس ویران جنگل میں مر جاؤں؟

جواب دے! اے لاہوتی مسائل کے عالم بے ہمتا! کیا تو یہ چاہتا ہے کہ وہ اولین تعلق ختم ہو جائے، جو میرے اور تیرے درمیان ہے؟

شیطان نے اپنے بازو پھیلائے، اس کی گردن آگے کی طرف جھک گئی اور وہ دیر تک کراہتا رہا۔ اپنے سبز، مائل مٹیالے رنگ میں وہ ایسا معلوم ہو رہا تھا، جیسے نیل کے کنارے مصری مجسمہ! جو زمانہ کی دستبرد سے بچ گیا ہو۔ اس نے سمعان پادری کو اپنی شعلہ فگن آنکھوں سے گھورا اور کہا:

”گفتگو نے مجھے نڈھال کر دیا ہے، حالانکہ میرے زخموں کا تقاضا یہ تھا کہ تجھ سے زیادہ باتیں نہ کروں۔ کس قدر تعجب کا مقام ہے کہ میں نے تیرے سامنے اس حقیقت کی توضیح کی ہے، جسے تو خود مجھ سے زیادہ جانتا ہے اور وہ باتیں بیان کی ہیں جو میری مصلحتوں کے مقابلہ میں تیری مصلحتوں سے زیادہ قریب ہیں! اب جو تیرا جی چاہے کر! مجھے اپنی پیٹھ پر اٹھا کر گھر لے جا اور میری مرہم پٹی کر یا یہیں پڑا رہنے

دے کہ میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاؤں۔"

شیطان گفتگو کر رہا تھا اور سمعان پادری سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔ حیرت و پریشانی کے لہجہ میں ہاتھ ملتے ہوئے کہا:

"مجھے وہ راز معلوم ہو گیا، جو اب سے ایک گھنٹہ پہلے مجھے معلوم نہ تھا۔ میری نادانی کو معاف فرما! اب میری سمجھ میں آ گیا تو دنیا میں آزمائش کے لئے بھیجا گیا ہے اور آزمائش ایک کسوٹی ہے، جس کے ذریعہ اللہ انسان کی قدر، قیمت پہچانتا ہے۔ بلکہ ایک ترازو ہے، جس میں خدائے بزرگ و برتر روح کو تول کر، اس کے ہلکے یا بھاری ہونے کا اندازہ کرتا ہے۔ میں نے جان لیا کہ اگر تو مر گیا تو یہ آزمائش اور اس کے ساتھ وہ معنوی قوتیں ختم ہو جائیں گی جو انسان کو پاکبازی کی تعلیم دیتی ہیں۔ بلکہ وہ سبب بھی زائل ہو جائے گا جو انسان کو نماز، روزہ اور عبادات کی طرف لے جاتا ہے۔ تجھے زندہ رہنا چاہئے! اس لئے کہ اگر تو مر گیا اور لوگوں کو اس کا علم ہو گیا تو دوزخ کے عذاب سے بے خوف ہو کر عبادات چھوڑ دیں گے اور گناہوں کی دلدل میں جا پھنسیں گے۔ تجھے زندہ رہنا چاہئے! اس لئے کہ تیری زندگی نوع انسان کو برائیوں سے بچاتی ہے۔ رہا میں! سو انسانی محبت کی قربان گاہ پر اس نفرت کو بھینٹ چڑھا دوں گا، جو مجھے تیری ذات سے ہے۔"

شیطان نے ایک قہقہہ مارا، جو آتش فشاں کے پھٹنے سے مشابہ تھا اور کہا:

"مقدس باپ تو کس قدر ذہین اور کتنا لائق ہے۔ لاہوتی مسائل کے متعلق تیرا مطالعہ کس قدر عمیق ہے! تو نے اپنی قوت ادراک سے میرے وجود کا سبب ظاہر کیا ہے، جو میں اس سے پہلے نہیں جانتا تھا۔ اب کہ ہم میں سے ہر ایک ان فطرتی اور لاہوتی اسباب کی حقیقت کو پا گیا ہے، جو ہماری آفرینش اول کے بھی ضامن تھے اور اس نشاۃ ثانیہ کے بھی، ہمیں یہاں سے چلنا چاہئے۔"

آ! بھائی میرے قریب آ، اور مجھے اٹھا کر اپنے گھر لے چل!

آہ! رات نے اپنا سیاہ پردہ چھوڑ دیا ہے، جب کہ میں اپنے جسم کے تقریباً آدھے خون سے اس وادی کے پتھروں کو رنگین کر چکا ہوں۔

سمعان پادری نے اپنی آستینیں کہنوں تک چڑھا لیں اور عبا کے دامن کو سمیٹ کر پیٹی سے کس لیا۔ اس کے بعد وہ شیطان کے پاس گیا اور اسے اپنی پیٹھ پر لاد کر سڑک کا رستہ لیا۔

ان پرسکون وادیوں میں جن کے چہرے پر رات کی سیاہ نقاب پڑی تھی، سمعان پادری اپنی پیٹھ پر ایک برہنہ جسم کو لادے، گاؤں کی طرف جا رہا تھا، جس کے زخموں سے خون بہہ بہہ کر اس کی داڑھی اور سیاہ کپڑوں کو دھبوں سے بھرتا جا رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

آزادی

کیا محکوم قوموں کے پہلو میں دل نہیں ہوتے یا دلوں میں آرزوئے آزادی نہیں ہوتی۔ کیا مسموم فضاؤں میں سانس لینا ان کے صفحہ تقدیر پر ہی تحریک ہوتا ہے یا دہر میں آنے کے جرم میں زندگی ان کے لئے دہکتا ہوا انگارہ بن کر رہ جاتی ہے۔

نہیں تو! اے آزاد کہلانے والی ہستیو! تم اپنی آزادی کے بے جا اور بے محل دعوے کیوں کرتی ہو اور کس لئے؟

جب تک روئے زمین پر ایک ذی روح ہستی بھی شکار غلامی ہے اور فنا کردہ خزاں جب تک اس کے جذبات کچلے جائیں گی اور آرزوئیں مجروح و حسرت زدہ رہیں گی۔

تب تک تمہیں بھی اس امر کا استحقاق نہیں کہ آزادی کے خوش آئند لفظ کو اپنے نام سے منسوب کرو اسی خیال خام میں مسرور رہو اور شاد و شاد۔

جب تم میں جذبہ احساس ہی نہ رہا اور نہ ہی مادہ امادہ باہمی جب اوروں کو محکوم بنا کر خود کو حاکم کہلانے میں تمہیں حسرت محسوس ہو اپنی خواہشات کے لئے مظلوموں کی تمناؤں کو خون آلودہ کر دینے میں باک نہ ہو اور نہ ہی ان کی آرزوؤں کی کونپلوں کو جھکا دینے میں کچھ جھجک۔

تو تم غلاموں سے کہیں بدتر ہو اور محکوم قوموں سے کہیں گئے گزرے تم آزادی کے قطعی غیر مستحق ہو اور اس امر کا تمہیں حق ہی نہیں کہ اس متبرک لفظ کو اپنے نام سے ملوث کرو۔ اس کی پاکیزگی کو آلودہ کر دو اور اس کی قیمت کو ارزاں۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

غریب

اس کی ناتواں ہستی سینہ زمین پر "بوجھ" سمجھی جاتی ہے بے مہر دنیا کے ہاتھوں برباد کی جاتی ہے اور کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح نوچ کر پھینک دی جاتی ہے۔

اور وہ بھی محض اس وجہ سے کہ یہ غریب کا شکار ہے اور راندی درگاہ سرمایہ دارہ و مفلسی کی زنجیروں میں پابجولاں ہے اور گرفتارو قفس ناداری! غریبی نے اس کی راہ کو پرخار بنا دیا ہے اور عرصہ حیات بے حد طویل اور بھاری جیسے وقت کی سوئیاں پیچھے مڑ کر رہ گئی ہوں۔

پھر مصائب کا ہولناک سمندر ہے دکھوں کی گرجتی ہوئی موجیں اور مدو جزر تکالیف۔

نگاہیں دو افق پر کسی چیز کو تلاش کرتی رہتی ہیں غمناک آنکھیں دریائے الم میں تیرتی رہتی ہیں اور اداس چہرے پر رنگت ملال لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جاتی ہے۔

اسی طرح قید حیات پوری ہو جاتی ہے جیسے ہوائی جھونکے سے اک ٹمٹماتا ہوا چراغ بجھ کر رہ جائے۔ شب دیجور کی لامحدود اور تاریک فضا میں نفوذ کر جائے اور تیرگی بردوش فضا میں ہمیشہ کے لئے روپوش ہو جائے۔

اف اس کی بے معنی زندگی جس کی مثال ایسی آگ جیسی ہے جس میں تپش ہے اور نہ روشنی یا ایسا ریگستان جس میں بگولے ہیں اور نہ ریت کے ٹیلے۔

ارمانوں کے ہجوم پر یاس کی اوس پڑتی رہتی ہے ہر گزرتی ہوئی گھڑی سوگوار بن جاتی ہے اور جان سپار زندگی ناکام آرزوؤں کا افسانہ بن کر رہ جاتی ہے اور اک مہیب ناک خواب اور یہ تمام اس جرم کی پاداش ہے کہ بے چارہ غریب، غریب ہے اور دور دراز لذت ہائے حیات، گونا گوں مسرتوں سے ناواقف اور چیرہ دستی فطرت کا شکار۔

☆☆☆☆☆

دہقان

پچھلے پہر کی چاندنی میں اس کے لئے سکون نہیں نہ ہی تاروں کی ٹھنڈی چھاؤں میں سرور ہے وہ صبح کی رنگینیوں سے متاثر نہیں ہو سکتا اور نہ نسیم کے پر کیف جھونکوں سے لطف اندوز۔

اس کی زندگی تو محض ایک کھیت تک محدود ہے اور کسی مہاجن کے در دولت سے وابستہ! اوھراما حسرت و یاس زندگی! جو مشتمل بر افلاس مکمل ہے اور مجسم بے کلی! ناتواں بازو، بار گراں اٹھانے سے معذور ہیں مگر پھر بھی ایک لمحہ آرام کئے بغیر کام کرنے پر مجبور۔ تھکی تھکی روح کشاکش حیات سے گریزاں ہے مگر بڑھتی ہوئی تگ و دو سے نپٹنے کے سوا چارہ نہیں چلنے میں قدم لڑکھڑا رہے ہیں مگر جرأت آرام ایک ساعت نہیں۔

اس کے الجھے الجھے بال، زرد زرد چہرہ اور تمازت آفتاب سے جھلسا ہوا جسم بتا رہے ہیں کہ یہ دہقان ہے اور فرزند کوہستان جس کی زمین کبھی سیم و زر اگلتی تھی جو آزاد تھا اور جنت نشان۔

مگر اس کے بچوں کے لئے آج زندگی لعنت مسلسل ہے اور قہر خداوندی وہ مفلس و بے نوا ہیں۔ غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے فاقہ مست مگر پھر بھی دم بخود و صورت جمیاد۔

تاہم وہ دن بھی دور نہیں جب یہی سرزمین خون سے لالہ گوں ہو جائے گی۔ آسمان پر تہلکہ مچ جائے گا اور ہوائیں چلتی چلتی تھم جائیں گی۔

اور یہ وقت ہوگا جب اپنے کھیتوں پر دہقان کا جائز تصرف ہوگا اس کے کمزور بازو علم سرمایہ داری کو نگوں کر دیں گے اور دہر کو اس سب سے بڑی مصیبت سے آزاد۔

اس وقت اسے صبح کی لطافتوں سے کیف حاصل ہوگا اور اولین شعاع آفتاب سے بہت تازگی حیات پتوں کی سرسراہٹ میں بہجت سے راگ سنائی دیں گے اور ہوا کے جھونکوں میں فراغت کے نغمے

* * *

بازیافت

بھول جاؤ گزری ہوئی ناکامیوں اور رفتہ و گزشتہ شورشوں کو! کم از کم کچھ دیر کے لئے تو بھول جاؤ۔

رنج و الم کی داستانوں اور مصائب کے لرزہ خیز افسانوں کو فراموش کر دو۔ اور صفحہ اول دل سے اک قلیل عرصے کے لئے محو۔

لمحات حیات مختصر ہی تو ہیں انہیں یاد ایام میں سرنگوں رہ کر کیوں گنوایا جائے؟

ان گزرے ہوئے دنوں کی یاد میں جو کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے جو اس طرح غائب از دہر ہو چکے ہیں جیسے عندلیب کی لے بہار کی ہواؤں میں تحلیل ہو جایا کرتی ہے۔

تم کھوئے ہوئے لمحات کے متلاشی ہو حالانکہ آنے والی گھڑیاں ان سے بھی کہیں قیمتی ہیں اور حامل بہجت و سرور۔

اس کی تو کچھ قدر کرو کہ بہار بھی مسلط بر سر دہر ہے اس کی تابشیں ہر ذرہ مدہوشی میں سرسراتی ہیں اور گھٹائیں لڑکھڑاتی ہوئی چلتی ہیں اور کائنات پر نشاط انگیز کیف چھا رہی ہے۔

اف! وقت کو تو قرار نہیں کہیں یہ ہنگامہ آفریں ساعتیں یونہی گزر جائیں اور تم یاد ایام میں کھوئے کھوئے رہو اور اسی افسانہ پارینہ میں بے خبر از دنیا و مافیہا۔

کیا تمہیں اس امر کا اندازہ نہیں کہ بہار کو سامان عیش لاتے دیکھ کر عندلیب دل نگار بھی تلخی ایام کو بھول گئی اب صحن گلشن میں کھلے ہوئے خوش رنگ پھول ہیں اور اس کے قلب مضطرب کے لئے سامان تسکین۔

دریا کا چلتا ہوا پانی بھی بہار کے مسرت خیز تاثرات سے خالی نہیں۔ وہ اک انداز والہانہ سے بہہ رہا ہے اور اس کی مسرتیں زبان بے زبانی سے مصروف کلام ہیں۔

مگر حیرت ہے کہ تم ابھی تک زمزمہ سرائیوں پر کمر بستہ نہیں۔ کیا ایسا کیف آگیں

وقت بار بار آتا رہتا ہے یا تمہیں اس کی قیمت کا کچھ اندازہ ہی نہیں؟

اف! اٹھو! بہار کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہوؤ اور اس کی دلفریبیوں سے محفوظ۔

زندگی کے دن دو چار ہی تو ہیں اور عالم ناپائیدار محض۔

تو پھر کیوں نہ ہر میسر آنے والی مسرت سے فائدہ اٹھایا جائے اور وقت کی سیمابی لہروں پر چھلکتے ہوئے عکس بہار سے کیف و مسرت۔

☆☆☆☆☆

اعتراف

یہ جانتے ہوئے بھی کہ دنیا نفرت گاہ ہے مجھے کبھی اس سے دلچسپی تھی۔

مجھے معلوم تھا کہ یہ مدفن ارمان ہے اور چند روزہ خواب وخیال لیکن پھر بھی مجھے اس سے لگاؤ تھا اور قلبی تعلق۔

یہ دیکھ کر کہ یہاں خود پرور انسان بستے ہیں جس کی کائنات مشتمل "برجھنکار زر" ہے۔ مجھے رنج ہوتا تھا اور اس کی نفس پروری پر تاسف۔

پر حیرت! کہ پھر بھی میں اس کی حد تک شیدائی تھی۔

غریبوں کو دیوانہ وار کشاکش حیات سے پنپتے دیکھ کر مجھے قلبی رنج پہنچتا۔ میری آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ جاتیں اور ان کے بڑھتے ہوئے مصائب پر ملول۔

لیکن دنیا کے لئے پھر بھی میں ایک پیار سا محسوس کرتی۔

پر اب! ہاں اب! وہ قابل نفرت اور اذیت دہ کشش ختم ہو چکی ہے اور مع اپنی دل فریبیوں کے درجہ صفر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔

روح اس مرقع جبر و استبداد سے نکل کر فضاؤں میں منتشر ہونے کو اس طرح بے قرار ہے جیسے پر سکوت ساز کے سینے میں کوئی نغمہ متلاطم ہو۔

یہاں کی امروز اب میرے لئے روز محشر سے کم نہیں اور فردا کا تصور ہی کپکپاہٹ طاری کر دیتا ہے۔

موت کا فرشتہ دھیرے دھیرے قدم آگے بڑھا رہا ہے کاش! وہ مجھے اپنی موت پناہ میں لے سکے اور اس طرح غائب از دہر کر دے جیسے آسمان سے کوئی تارا ٹوٹے اور فضاؤں میں گھل کر رہ جائے موسیقی سے معمور سکون میں جب آسمان پر ستارے چمکتے ہیں تو میرا دل اس وادی میں پہنچنے کو بے قرار ہو جاتا ہے جہاں سکون ہی سکون ہے اور پاکیزگی نے اپنا دل نکال کر خطہ زمین پر بکھیر دیا ہے۔

جہاں آسمانی ساز پر حوریں نجات کے گیت گاتی ہیں اور فرشتے اپنے سفید سفید

پروں سے سایہ کیے ہوئے ہیں۔

کاش! میں اس وادی میں پہنچ سکتی جو اس دنیا سے بالکل متضاد ہے اور اس کا ماحول یہاں سے جداگانہ۔

☆☆☆☆☆

IqbalCyberLibrary.Net
All Rights Reserved
2002-2006

پروانے

ننھے سرفروش! اس بے قراری سے شمع کا طواف کیوں کر رہا ہے مطلوب کے قریب پہنچ کر بھی اتنی بے چینی اس قدر آہ و زاری۔

شب کی تاریکی میں لپٹی ہوئی ہر شے غرق خواب نوشیں ہے لیکن تیرے لئے شاید نیند کا نام عنقا ہو گیا تیرے شاندار قافلے کے ہم سفر لمحہ بہ لمحہ کم ہو رہے ہیں لیکن تجھ پر کوئی اثر ہی نہیں۔ اس قدر غرق یم خیال کہ اپنے آپ تک کا ہوش نہیں۔

جانباز پروانے! شعلہ بار آتشیں لو پر اپنی ہستی سے بے نیاز ہو کر لپکنا اور بیک ثانیہ بے جان ہو کر محبوب کے قدموں پر گر پڑنا کیا تیری اصطلاح میں انجام حیات اسے ہی کہتے ہیں۔ کہ شمع کے اندر اندر گھلنے کا دلسوز منظر برداشت سے باہر ہے۔

رات کی تاریکی رفتہ رفتہ بڑھ رہی ہے۔ کائنات مردہ صد سالہ کی طرح خاموش ہے اور ہر ذرہ نشہ خواب میں لڑکھڑاتا ہوا۔ پرندے آشیانوں میں ساکت ہیں اور درندے جنگلوں میں خوابیدہ۔

لیکن تیری یہ شب بیداری کیسی؟ تو کوئی ننھا سا دیوتا تو نہیں جو شمع کی حیات جاودانی اور اپنی قبولیت قربانی کے لئے دست بدعا ہے۔

تصویر درد! آسمان پر چاند بھی طلوع ہو گیا اس کا عکس جھیل کے پانی پر ناچ رہا ہے اور سمندری موجوں کے نغموں نے سالخوردہ دنیا کے چہرے پر مسکراہٹ طاری کر دی۔

لیکن تو! آہ! کہ تیری کائنات مشتمل بر یک شمع ہے اور اس کی آتشیں لو میں ما حصل حیات پوشیدہ۔

عندلیب شیدا تو ہر وقت سرگرم فغاں رہتی ہے اور سننے والوں کے لئے سامان محشر سے کم نہیں لیکن آفریں ہے تجھے! کہ لپکتے ہوئے شعلے کو بوسہ دینے کی تمنا اشتیاق فنا کو دوبالا کر دیتی ہے۔

اللہ ! اللہ یہ وارفتگی کہ دہر میں دم بھر کا قیام بھی بار خاطر ہے۔ دل صد پارہ میں اک عزم آہنی ہے اور روح کی گہرائیوں میں ملکوتی درخشانی۔

کتنی مختصر ہے تیری زندگی لیکن کس قدر شاعرانہ اور بعید از وسعت خیال۔

☆☆☆☆☆

IqbalCyberLibrary.Net
All Rights Reserved
©2002-2006

شیاما

کہر آلود فضا میں سرگرداں شیاما! تو اس قدر بے قرار کیوں ہے؟ ان ننھے ننھے پروں میں یہ اضطراب کی بجلیاں کیسی؟ اور یہ سوز و گداز سے لبریز آواز! جیسے کوئی راندہ درگاہ فرشتہ نجات کے گیت الاپ رہا ہو۔

ننھی سی معصوم شیاما! تو شعلہ کی طرح لرزاں اور غرق یم خیال کیوں ہے؟ کیا تیرا مطلوب کہیں روپوش ہو گیا یا دہر کی نمناک خلا میں کوئی جائے قیام نہیں رہی۔

برشگال کی اس حسین صبح کو جب مینہ برس کر کھل جاتا ہے اور آسمان پر قرمزی بادلوں کے ٹکڑے دوڑتے پھرتے ہیں تو تیری حیران سی آنکھوں میں ایسی چمک کہاں سے آ جاتی ہے۔ یہ متحیر کن چمک! جو پہلی شعاع آفتاب سے بھی زیادہ درخشاں ہے۔

تیری وہ معصومانہ ادائیں وہ حسن ملیح اور وہ پیکر نزاکت ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آسمان کی ابر آلود چھاتی سے کوئی جل پری اتر آئی ہے۔

اور اس پر بھی یہ انتظار مسلسل فضاؤں میں کسی کی جستجو اور جنبش پیہم!

حسین پرند! تجھ میں اس قدر شوریدگی کیوں ہے اور یہ بڑھتی ہوئی وارفتگی کاش! اس کا ازالہ کسی کے بس میں ہوتا۔

جب تو ساون میں ملہار گا رہی ہے کیف سرمدی عطا کرنے والے ملہار! جیسے گلاب کی پتیوں پر ہلکی ہلکی بوندیں پڑ رہی ہوں تو نبض کائنات تیز تیز ہو جاتی ہے اور ہر شے احساس حیات سے جنباں۔

میرے قلب حزیں پر کوئی نامعلوم خلش اور بے پایاں اداسی چھا رہی ہے موسیقار شیاما! کوئی نغمہ چھیڑ دے روح کو سرشار کر دینے والا نغمہ! تا کہ آلام کے یہ گھرتے ہوئے بادل چھٹ جائیں اور تیری بڑھتی ہوئی خستگی بھی مبدل با طمینان ہو۔

میری حسین شیاما! مجھے ایک سکوں بخش نغمہ سنا دے۔

☆☆☆☆☆

محفل عندلیب

رات سنسان ہے اور بدھ مندروں جیسی تر ایک نیند کی طلسمی دیوی ہر ایک کو اپنے حلقہ دام میں لا چکی۔ شورید سمندری موجیں کسی نوزائیدہ بچے کی طرح عالم مدہوشی میں ہیں۔

کبھی کبھی ایک شرمیلی سرسراہٹ سے پتے کانپنے لگتے ہیں یا کسی ننھے پرند کی چیخ اس جمود کو توڑ دیتی ہے اور سب سکوت ہے اور کائنات مردہ صد سالہ کی طرح ساکت۔

ایسے عالم سکون میں چند عندلیبیں گلاب کے پودے پر جمع ہیں صد پارہ دل کی سینہ میں لئے اپنا مسئلہ تقدیر حل کر رہی ہیں چمن کا پتہ پتہ محو خواب ہے اور تھکی ہوئی شاخیں سر جھکائے ہوئے فضا میں ایک مہیب سا خوف سانس لے رہا ہے۔

کبھی کبھی زرد چاند کفن میں لپٹی ہوئی نعش کی طرح نظر آ جاتا ہے یا کوئی مقید لہر ساحل سے ٹکرا کر آہ وزاری کرنے لگتی ہے۔

اس کے سوا کوئی نشان حیات نہیں سکون کامل ہے اور شہر خموشاں کا سا ماحول۔

کبھی کبھی ہوا سسکیاں بھرنے لگتی ہے یا آسمان پر کہیں کہیں بادل کے ٹکڑے نظر آ جاتے ہیں۔ لیکن دفور گریہ سے لڑکھڑاتی ہوئی عندلیبیں ماحول سے بے نیاز ہیں اور اپنی ہستی سے بے خبر۔

ان کا مطمح نظر تو صرف ایک ہی ہے محض ایک خیال ان کے قلوب پر حاوی اور معصوم روحوں کو مجروح کر رہا ہے۔

اور وہ یہ کہ اگر صباح فردا ''حامل خزاں'' بن کر آئی تو ''رنگ چمن'' کیا ہو جائے گا استبداد کے پنجہ آہنی میں گرفتار ہونے سے ساکنان چمن پر کیا بیتے گی اور یہ تجدید کتاب حیات کا کون سا ورق پیش نظر کرے گی۔

☆☆☆☆☆

مسئلہ حیات

موسم خزاں کے دھندلے آسمان پر تارے چمک رہے ہیں رات کے ہلکے ہلکے سائے گہرے ہو چلے اور شوریدہ جھونکوں کی مسلسل چھیڑ سے لرزاں شاخیں ساکت!

اس مغمور خواب وقت میں، میں غرق یم خیال ہوں دل ناتوانی کے عمیق سمندر میں ڈوب رہا ہے اور روح مائل بہ پریشانی جیسے رباب کے تار ٹوٹ کر اس کے نغموں کو خاموش کر دیتے ہیں۔

کاش! میں مسئلہ حیات کی تہہ تک پہنچ سکتی یہ پیچیدہ مسئلہ حیات! جسے جتنا سلجھانا چاہتی ہوں اسی قدر الجھتا چلا جاتا ہے۔

دور گھنی جھاڑیوں میں کوئل کوک رہی ہے کیا اس کی آواز پر از سوز و ساز نہیں یا اس کا نغمہ آوازہ فغاں سے کم ہے۔

ماہ شب تاب اپنی جملتابانیوں سے دہر کو جگمگا رہا ہے لیکن اس کی ہر لحظہ بڑھتی ہوئی زردی؟ آہ! یہ تو کچھ اور ہی کہتی ہے۔

اور یہ دہر! مخزن راحت و آرام؟ جس کے سالخوردہ چہرے پر آنے والا لمحہ ایک نئی شکن ڈال دیتا ہے جس کا قلب امتداد زمانہ سے چور چور ہے اور ہستی بے بال و پر۔

سکوت شب! اپنی آغوش میں صدہا ناہائے یاس پنہاں کئے ہوئے ہے۔

تو پھر؟ جب ہر طرف درد کے مضراب چھڑ رہے ہوں تو حیات فانی "مشتمہ بہ چند نوحہ ہائے پرسوز" ہوئی نہ اور معدن گریہ و الم لیکن پھر باد سحر کے لطیف جھونکے جو اپنی جنبش پیہم سے نبض کائنات کو تیز تر کرتے ہیں۔

بیگانہ از ہستی و نیستی سمندر ہے جو اپنی سریلی آواز سے لمحات حیات کو لافانی بنانے کی تلقین کرتا ہے۔

یہ پر سرور نغمات موسیقی! جو اس طرح بے قرار کر دیتے ہیں جیسے ساز کے پر سکوت تاروں میں کوئی نغمہ متلاطم ہو۔

اور پہلی شعاع آفتاب! حیات نو کی علمبردار اور تبسم سے بڑھ کر حسین۔

تو معبود! ''نوحہ ہائے غم'' کے ساتھ یہ ''نغمات شادمانی'' کیوں؟ یہ انجماد جرعات تلخ و شیریں کیسا؟

بلند گہرائیوں سے ایک شوخ ستارہ میری شوریدگی پر ہنس رہا ہے۔ سیاہ رات اپنا لبادہ لپیٹنے میں مصروف ہے اور صباح کی دھندلی کرنوں نے تعاقب تاریکی شروع کر دیا۔

لیکن میں اسی طرح مسئلہ حیات تک پہنچنے کی ناتمام کوشش میں مصروف ہوں۔

آہ! یہ دشوار ترین مسئلہ!

جس سے تنگ آکر اک دل جلا شاعر کہتا ہے۔

بعد یک عمر بھی نہ جینے کا انداز آیا
زندگی چھوڑ دے پیچھا مرا میں باز آیا

☆☆☆☆☆

کس نے

بہار مخزن مسرت کیونکر ہوگئی؟ اس کی ہر شے کو اپنے رنگ میں رنگ کر دلفریب کس نے بنا دیا؟ اور ہوا کے مسلسل جھونکوں سے نوشگفتہ غنچوں میں لرزش کہاں سے آ گئی؟

یہ روپہلی اور سنہری پروں والی تتلی کسی چمکیلی وادی کی مقدس حور! اسے ملکۂ نزاکت کس نے بنا دیا اور اپنے ہی حسن پر مست خرا۔

دور سے سنائی دینے والا نغمہ اتنا پر کشش کیوں ہوتا ہے اور حسین پھولوں میں شان دلربائی کس نے پیدا کر دی۔

جب افق کے کنارے دن کو الوداع کہنے لگتے ہیں تو کس کی لانبی انگلیاں ان پر سرخیاں بکھیر دیتی ہیں اور غروب ہونے والی کرنوں کو تبسم جیسا حسین کس نے بنا دیا؟ جیسے فانوس میں ایک شعلۂ آتشیں لرز رہا ہو۔

کرمک شب تاب کو پاسبان عروس شب کس نے بنا دیا اور بہتے ہوئے جھرنے کو اپنی تیز روانی پر نازاں۔

کس نے؟ آہ! کس نے؟ اپنی جنبش پیہم سے نبض کائنات تھام رکھی ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

مرغ بادنما

مرغ بادنما نے ہوا سے کہا ''تمہارا ہمیشہ ایک ہی طرح چلتے رہنا تھکا دینے والا ہے۔ کیا تم میرے چہرے سے ہٹ کر کوئی دوسرا رخ اختیار نہیں کر سکتیں؟ کیونکہ تم میری خداداد استقامت کر پریشان کیے دیتی ہو۔''

لیکن ہوا نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور فضا میں صرف ایک قہقہہ سنائی دیا۔

☆☆☆☆☆

شاہ اردوس

ایک دفعہ اردوس کے زعما بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوئے، اور اس سے درخواست کی کہ وہ اپنی مملکت میں ایک ایسا فرمان جاری فرمائے جس کی رو سے رعایا کے لئے تمام قسم کی شرابیں اور دیگر منشیات ممنوع قرار دی جائیں۔

لیکن بادشاہ نے ان کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور ہنستا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

تب شہر کے زعما مایوس ہو کر وہاں سے لوٹے۔

محل کے دروازے پر وہ حاجب سے ملے اور حاجب نے معلوم کیا کہ انہیں کچھ رنج ہے۔ اور وہ ان کے معاملے کی تہ تک پہنچ گیا۔

پھر اس نے کہا ”حالت قابل رحم ہے میرے دوستو“

لیکن اگر تم بادشاہ کو ایسی حالت میں ملتے جبکہ وہ نشہ میں چور ہوتا تو وہ تمہاری درخواست یقیناً قبول کر لیتا۔

☆☆☆☆☆

دل کی گہرائی

میرے دل کی گہرائیوں سے ایک پرندہ اٹھا اور آسمان کی طرف اڑ گیا ہو وہ بلند سے بلند تر ہوتا گیا۔ لیکن اس کا قد کاٹھ چھوٹا ہونے کی بجائے بڑھتا گیا۔

پہلے وہ ایک ابابیل اتنا تھا۔ پھر کوے جتنا اس کے بعد ایک شاہین کے برابر اور پھر اتنا بڑا ہو گیا۔ جتنا کہ ابر بہار اور پھر اس نے ستاروں سے بھرپور آسمان کو ڈھانپ لیا۔

میرے دل کی گہرائیوں سے ایک پرندہ آسمان کی طرف اڑا جوں جوں وہ اڑتا گیا بڑا ہوتا گیا۔ لیکن وہ میرے دل سے نہ نکلا۔

اے میرے عقیدے اور غیر تربیت یافتہ علم! میں تیری بلندی پر کیونکہ پہنچ سکتا ہوں۔ اور انسان کی امفوق البشریت کو کیونکر آسمان پر منقوش دیکھ سکتا ہوں۔

میں اپنے دل کے سمندر کو دھند میں کیسے بدل سکتا ہوں اور اس ناقابل پیائش خلا میں کیونکر تیرا ساتھ دے سکتا ہوں۔

ایک معبد میں قیدی معبد کے سنہری میناروں کو کیسے دیکھ سکتا ہے۔

ایک پھل کے دل کو کیونکر اتنا وسیع کیا جا سکتا ہے۔ کہ وہ پھل کو اپنے آغوش میں لے لے۔

اے میرے عقیدے! میں چاندی اور آبنوس کی سلاخوں کے پیچھے پابہ زنجیر ہوں اور تیرے ساتھ پرواز نہیں کر سکتا۔

پھر بھی تو میرے دل سے آسمان کی طرف اڑتا ہے۔ اور یہ میرا ہی دل ہے۔ جو تجھے اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ اور میں اس بات پر مطمئن ہوں۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

دو راستے ایک منزل

لبنان کی ایک گھاٹی میں صدیاں گزریں، دو فلسفی ملے۔

ایک نے دوسرے سے پوچھا۔

"کہاں جارہے تم؟"

دوسرا بولا

"میں شباب کے چشمے کی تلاش میں ہوں اور وہ میرے خیال میں یہیں کہیں ان پہاڑیوں سے پھوٹتا ہے۔ میں نے اس کی بابت پرانے صحیفوں میں بھی دیکھا ہے کہ وہ سورج کی طرف پھول کی طرح کھلتا ہے۔"

پہلے نے جواب دیا۔

"مگر میں تو موت کے بھید کی تلاش میں ہوں۔"

دونوں فلسفی اپنے اپنے دل میں یہ سمجھ رہے تھے۔ کہ دوسرا حکمت سے بالکل بے بہرہ ہے، اور اس نظر سے کوراجو اسے ودیعت کی گئی ہے۔ وہ ایک دوسرے پر اپنی برتری جتانے کے جنون میں بھڑ گئے۔

وہ ایک دوسرے کی روحانی عظمت بصیرت و بصارت کو جھٹلا رہے تھے۔

جھگڑا بڑھتے بڑھتے بات ہاتھا پائی تک پہنچی تو کہیں سے ادھر ایک ایسا دیہاتی آن نکلا، جسے اس کے گاؤں والے، سیدھا سادا، اور بیوقوف سمجھتے تھے

اس نے ان دو پڑھے لکھے عالموں کو جھگڑتے دیکھا، تو ان کی باتیں سننے کے لئے رک گیا! کچھ دیر دور کھڑا ان کی باتیں سنتے رہنے کے بعد وہ ان کے قریب آگیا اور انہیں اپنی طرف متوجہ کر کے بولا۔

"میرے دوستو، معلوم ہوتا ہے، آپ دونوں فلسفے کے ایک ہی نظریئے پر متفق ہیں۔ اور آپ دونوں کو ایک ہی چیز کی جستجو ہے۔ اگرچہ آپ دونوں نے اسے الگ نام دے رکھے ہیں۔"

آپ میں سے ایک کو چشمہ شباب کی تلاش ہے، اور دوسرے کو اسرار موت کی جستجو حقیقت میں یہ دونوں ایک ہی ہیں، اور آپ دونوں کے اندر موجود الوداع میرے دوستو!

اجنبی یہ کہہ کر رخصت ہو گیا، وہ ان سے کسی قدر فاصلے پر پہنچتے ہی دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا۔

دونوں فلسفی پل بھر، تو چپ چاپ کھڑے ایک دوسرے کو تکتے رہے اور پھر ایکا ایکی وہ بھی کھل کھلا کر ہنس پڑے!

ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا۔

''تو کیوں نہ اب ہم ایک ساتھ تلاش شروع کریں؟''

☆☆☆☆☆

شراب کہنہ

ایک امیر وک اپنے سرد آب اور اپنی پرانی شراب پر بڑا ناز تھا۔ اس کے پاس پرانی شراب کا ایک بہت بڑا پیانہ تھا۔ جو کسی خاص تقریب کے لئے جس کا صرف اسے ہی علم تھا۔ سرد آب میں مدتوں سے رکھا تھا! شہر کا حاکم اس کے یہاں آیا، تو اس نے سوچا۔

"پرانی شراب کا پیانہ میں معمولی حاکم کے لئے کھول دوں۔ نہیں ہرگز نہیں!"

کلیسا کا بڑا پادری اس کی ملاقات کے لئے آیا لیکن اس نے اپنے آپ سے پھر یہی کہا۔

"نہیں وہ پیانہ میں نہیں کھولوں گا اس پادری کو پرانی شراب کی قدر کیا معلوم اس کی تو مہک بھی اس کے نتھنوں تک نہیں پہنچنا چاہئے۔"

اس ملک کا شہزادہ اس کے یہاں کھانے پر آیا، لیکن اس نے سوچا "یہ عظیم الشان شراب اور ایک معمولی شہزادے کے پیالے میں انڈھا دوں نہیں ہرگز نہیں!"

یہاں تک کہ اپنے بھتیجے کی شادی پر جہاں بڑے بڑے رئیس و امراء مدعو تھے۔ اس نے اپنے آپ سے صرف یہی کہا۔

"نہیں، ان مہمانوں کے لئے ہرگز میں اپنی پرانی شراب کا پیانہ نہیں کھول سکتا!"

وقت یونہی گزر گیا، اور آخر کار بوڑھا مر گیا، معمولی آدمیوں کی طرح اسے بھی خاک کے سپرد کر دیا گیا جس دن اسے دفن کیا گیا اس دن وہ قدیم پیانہ شراب کے دوسرے مٹکوں کے ساتھ باہر لایا گیا جسے اس نواح کے دیہاتیوں نے آپس میں بانٹ لیا مگر کسی کو اس پرانی شراب کی کسی خاص خوبی کا پتہ تک بھی نہ چلا ان کے نزدیک جو کچھ بھی ساغر میں انڈھیلا جائے صرف شراب ہے!

☆☆☆☆☆

پاگل خانہ

پاگل خانے کے باغ میں، میں نے ایک نوجوان کو دیکھا۔ جس کا خوبصورت چہرہ پیلا پڑا جا رہا تھا۔ جس پر تحیر کی سیاہی چڑھی ہوئی تھی! میں اس کے پاس بنچ پر بیٹھا اور میں نے پوچھا تم یہاں کیسے؟

اس نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا اور کہا

یہاں آپ کا یہ سوال اگرچہ بے معنی ہے
بہر حال میں جواب ضرور پیش کروں گا۔

"میرے باپ کی یہ خواہش تھی کہ میں ہو بہو اس کا نمونہ بنوں اور یہی تمنا میرے چچا کی تھی، میری ماں کی آرزو تھی، کہ میں اپنے مرحوم نانا کے نقش قدم پر چلوں اور میری ہمشیرہ اپنے بے باک ملاح خاوند کو میرے لئے بہتر نمونہ سمجھتی تھی۔ میرا بھائی سوچتا کہ مجھے اور کچھ نہیں، بس اس کی طرح ایک نامی گرامی پہلوان بننا چاہئے!"

اور یہی حال میرے اساتذہ کا تھا۔ فلسفے کے استاد، موسیقی اور منطق کے، سب کی یہی خواہش تھی اور وہ بڑی جانفشانی سے اس کوشش میں تھے کہ وہ مجھ میں اپنے جوہر اس طرح معکوس دیکھیں، جس طرح آئینہ میں اپنا عکس دیکھتے ہیں!

"اور میں یہاں اس لئے چلا آیا کہ یہاں مقابلتاً زیادہ سکون ہے۔ اور میں کم از کم میں تو بن سکتا ہوں؟"

پھر ایکا ایکی وہ میری طرف مڑتے ہوئے بولا "لیکن آپ یہاں کیسے پہنچے، اونچی تعلیم یا اچھی صحت کے فیض سے؟"

میں بوکھلا سا گیا۔

"نہیں نہیں میں تو صرف ملاقاتی ہوں"

ہوں وہ بولا

میں تو سمجھا آپ ان میں سے ہیں۔ جو اس دیوار کے ادھر والے پاگل خانے میں رہتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

IqbalCyberLibrary

محبت یا نفرت

عورت نے مرد سے کہا

’’مجھے تم سے محبت ہے‘‘

مرد بولا

’’وہ میری دلی تمنا ہے کہ میں تمہاری محبت کے قابل بن جاؤں!‘‘

پھر عورت نے کہا

’’تو کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے؟‘‘

مرد نے صرف اس کی طرف دیکھا اور خاموش رہا۔

اس پر عورت نے چلانا شروع کر دیا

’’مجھے تم سے نفرت ہے میں تم سے شدید نفرت کرتی ہوں!‘‘

اور مرد نے کہا

’’تو پھر یہ میری دلی آرزو ہے، کہ تمہاری نفرت کے قابل بن جاؤں!‘‘

☆☆☆☆☆

تعبیر

ایک آدمی نے ایک سپنا دیکھا جب اس کی آنکھ کھلی تو اپنے خواب کی تعبیر کے لئے اپنے معبر کے پاس پہنچا معبر نے اسے کہا۔

''میرے پاس جب ایسے خواب لے کر آؤ گے، جنہیں تم نے بیداری میں دیکھا ہو تو ان کی تعبیر میں تمہیں بتا سکوں گا کیوں کہ تمہاری نیند کے سپنوں کو نہ تو میری عقل سے کوئی نسبت ہے اور نہ ہی تمہارے تخیل سے کوئی واسطہ!''

☆☆☆☆☆

مجرم

ایک نوجوان سرِ راہ بیٹھا، بھیک مانگ رہا تھا۔ قوی الجثہ نوجوان، جسے بھوک نے بے جان کر دیا تھا، اور وہ سڑک کے موڑ پر آنے جانے والوں کے سامنے ہاتھ پھیلائے بیٹھا تھا، منتوں سے گڑگڑا کر سوال کر رہا تھا، اپنی ذلت و بدبختی کی کہانی دہرا رہا تھا، بھوک کی تکلیفوں کا دکھڑا رو رہا تھا۔

رات نے اپنا پرچم گاڑ دیا۔ نوجوان کے ہونٹ خشک ہو گئے اور زبان زخمی، لیکن ہاتھ پیٹ کی طرح خالی رہا۔

وہ اٹھا اور شہر کے باہر چلا گیا۔ وہاں درختوں کے جھنڈ میں بیٹھ کر وہ زار و قطار رونے لگا۔ اس کے بعد اس نے اپنی آنکھیں آسمان کی طرف اٹھائیں، جن پر آنسوؤں کا پرچہ پڑا تھا۔ اس عالم میں کہ بھوک اس کا کلیجہ کھرچے لیتی تھی، اس نے کہا:

”خدایا! میں سیٹھ کے ہاں کام کی تلاش میں گیا، لیکن میرے بدن پر بسیرے لگے دیکھ کر اس نے مجھے نکلوا دیا۔ میں نے اسکول کا دروازہ کھٹکھٹایا، لیکن ہاتھ خالی ہونے کی وجہ سے مجھے گھسنے نہ دیا گیا۔ صرف دو وقت کی روٹی پر میں نے نوکری کرنی چاہی، لیکن میری بدقسمتی کہ اس سے بھی محروم رہا۔ مجبور ہو کر بھیک مانگنے کی کوشش کی، لیکن یا رب! تیرے بندوں نے میری طرف دیکھا اور یہ کہہ کر آگے بڑھ گئے کہ ”یہ موٹا مشٹنڈا ہے ایسے ہڈ حرام کو بھیک دینا جائز نہیں۔

یا رب! مجھے میری ماں نے تیرے حکم سے جنا اور اب میں تیرے وجود کی بناء پر زندہ ہوں! پھر لوگ مجھے روٹی کا ٹکڑا کیوں نہیں دیتے، جب کہ میں تیرے نام پہ مانگتا ہوں۔

غم زدہ نوجوان کا چہرہ متغیر ہو گیا اور آنکھیں شعلوں کی طرح چمکنے لگیں۔ وہ اٹھا اور خشک شاخوں میں سے ایک موٹی ٹہنی اٹھا لی، پھر اس نے شہر کی طرف اشارہ کیا اور

بلند آواز سے چلایا:

''میں نے ماتھے کے پسینے کے عوض زندگی طلب کی، لیکن اسے نہ پایا، اب میں اسے اپنے بازوؤں کی قوت سے حاصل کروں گا! میں نے محبت کے نام پر روٹی مانگی، لیکن انسان نے کوئی توجہ نہ کی اب میں ظلم و سرکشی کے نام پر روٹی ہی نہیں بلکہ اور بہت کچھ اس سے لوں گا اور وہ دینے پر مجبور ہوگا!''

ایک زمانہ گزر گیا۔ نوجوان ہاروں کے لئے برابر گردنیں کاٹتا اور اپنے لالچ کے محل تعمیر کرنے کے لئے مسلسل روحوں کے ہیکل مسمار کرتا رہا، یہاں تک کہ اس کی دولت بے اندازہ اور شجاعت عام ہوگئی۔ ملک کے ڈاکو اس کو محبوب رکھنے لگے اور حکومت کے ارکان اس کے نام سے ڈرنے لگے۔ انجام کار بادشاہ نے اس شہر میں اسے اپنا نائب بنا دیا اور اپنے معتمدین کے حلقہ میں شامل کر کے اسے منصب امارت پر فائز کر دیا۔

اس طرح انسان اپنی کنجوسی سے مسکین کو بدمعاش اور اپنی سنگدلی سے امن پسند کو قاتل بناتا ہے!

☆☆☆☆☆

ماہ شب تاب

کس قدر حسین ہے تو! اے ماہ شب تاب!! اور کیا پیکر پاکیزگی۔

جیسے بلند آسمان کا کوئی مقدس فرشتہ نجات کی تلقین کر رہا ہو۔

اکثر پر سکوت راتوں میں جب کہ میرے خیال پر اداسی چھا جاتی ہے۔ پر فریب دنیا کی نت نئی شعبدہ بازیوں سے۔

اور میں اپنی ہستی سے بیزار ہو جاتی ہوں اور مجسم بے کس ہستی سے

تو تیری اٹھلاتی ہوئی کرنیں دریچہ سے داخل ہوتی ہیں جیسے قسمت ناکام کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے لئے کہہ رہی ہوں۔

اور جب دامن شب کی آڑ میں دہر کے گناہوں میں اضافہ ہو جاتا ہے اہرمن کے فرستادہ کائنات کے چپے چپے پر چھا جاتے ہیں اور فضا میں ایک آسیبی سا سکوت ناچتا ہے۔

تو میرا کمزور دل، اس ماحول سے دہل جاتا ہے اور تیری ہر آلودگی سے پاک، مقدس روشنی تک پہنچنے کے لئے بے قرار۔

اور کیسا طمانیت بخش ہوتا ہے وہ لمحہ! جب تیری قبائے الوہیت پر میرا لبادہ بن جاتی ہے اور تیری روحانیت مددگار۔ میں اپنے آپ کو دنیائے معصومیت میں محسوس کرتی ہوں جہاں تیری کرنیں راہبر ہوتی ہیں اور جمال بے پایاں، سامان راحت۔

لوگ کہتے ہیں کہ دنیا میں دلچسپیوں کی کمی نہیں لیکن ماہ شب چراغ! میں ان فانی دلچسپیوں سے بے نیاز رہنا چاہتی ہوں۔ جن کے تعاقب میں اضطراب کی لہریں ہیں اور الم کے چھینٹے۔

میرے خیالات کا لعل بے بہا تو تو ہی ہے اور زندگی کے تاریک کھنڈر کی روشنی بھی جس کی درخشانی پر امتداد زمانہ بھی اثر انداز ہونے سے معذور ہے۔

سرمایہ تسکین! جب تو شب چہاردہم کو اپنا جلوہ دکھاتا ہے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ

نیکی کی مقدس دیوی جلوہ گر عالم بسیط ہے دہر سے گناہوں کا خاتمہ وہ گیا اور ہر چہار طرف عرفانیت کا دور دورہ ہے

تیرا جمال روح پرور! جسے دیکھ کر میری روح رقص میں آجاتی ہے تو اسی طرح اپنا روئے منور دکھایا کرتا کہ کائنات سرشار رہے تیری تقدس مابی ہے اور الوہیت سے۔

اس عالم سفلی میں! دنیائے لاہوت کی جھلک دکھانے والے ماہ، الم تاب!

☆☆☆☆☆

All Rights Reserved
2002-2006

نغمات حیات

زندگی تمہارے لئے ایک بربط شیریں ہے۔ عزیز دوست! اور مخزن نغمات شادمانی!! جو محض ذرا سی چھیڑ پر مسرتوں کا انبار لگا دیتا ہے۔

لیکن مجھے تو یہ حاصل نغمہ ہائے بے کیف معلوم ہوتا ہے اور قبل از وقت بے کار۔

تم اسے سرسبز و شاداب غنچہ قرار دو لیکن میرے لئے تو ایک کملایا ہوا پھول ہے جس میں رنگ ہے اور نہ خوشبو۔

اسے اک کیف آفریں خواب نہ تصور کرو۔ اس کی تعبیر تو مایوس کن ہے اور حد خیال سے بڑھ کر غم آگیں۔

یہ اک شاداب کھیتی ہی لیکن ہر لکہ ابر کو باران مسرت سمجھنے والی جوانی آرزوؤں کو جڑ نہ پکڑتے دیکھ کر اجڑ جاتی ہے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آرزوئے شگفتگی سے بے نیاز۔

وادی حیات دلفریب نظر آتی ہے اور تبسم سے بھی بڑھ کر حسین، جہاں چاند اپنی پوری شوخی سے چمکتا ہے۔ مسرور ستارے اس کے گرد رقص کرتے ہیں اور نیم خوابیدہ کلیوں کو نسیم سحر کے جھونکے دعوت دے دیتے ہیں۔

لیکن حقیقت میں یہ وادی پر فریب ہے۔ ان زہریلے جھونکوں میں، کلیوں کی خوابیدگی میں مایوسی منہ چھپائے ہوئے ہے تاکہ موقع پاتے ہی اپنی آہنی گرفت میں لے لے اور یہ زندگی جسے شہد جیسے سانسوں سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ میرے نزدیک ایک جرعہ ہلاہل ہے جسے محض چھونا ہی سینکڑوں مصائب کا پیش خیمہ ہو۔

اے مالک! کیا اس شوریدہ بربط کا کوئی ایسا نغمہ ہے؟ جو میرے قلب حزیں کو ایک لمحہ سکون دے سکے اور پریشان دماغ کو طمانیت

ایک ایسا نغمہ! جو کچھ دیر کے لئے مجھے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دے اور اپنی تھرتھراتی ہوئی گونج میں پوشیدہ۔

☆☆☆☆☆

نالۂ بے اختیار

تم کہتے ہو کہ حوادث حیات سے ہنستے کھیلتے دن گزارنے چاہئیں۔ پر خوشی! آہ اس دہر میں خوشی ہی تو ناپید ہے۔ اک پھیکی سی مسکراہٹ بھی تو ہزاروں تلخیاں پوشیدہ کئے ہوئے ہے۔

کیا پپیہے کی پی پی میں گداز نہیں یا کوئل کی کوک مرقع الم نہیں۔ گرم دوپہر کو کوے کی کائیں کائیں بھی تو درد آمیز معلوم ہوتی ہے۔

یہ نیلگوں آسمان! مسکن ماہ و انجم!! کبھی تو نے اس کی سرخی خون جگر کو بھی دیکھا ہے افق کے سنہرے کناروں پر چھائی ہوئی سرخی۔

اور مہر عالم تاب! سبب درخشانی کائنات! خزاں کی دوپہر کو زرد ہو جاتا ہے جیسے ناتوانی کے سمندر میں اندر ہی اندر ڈوبا جا رہا ہو۔ نغمات چنگ و رباب! مجھے تو آہو کے مضراب سے نکلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

اور مٹیالے بادل جو برس کے فضا میں تحلیل ہو جاتے ہیں جس طرح کسی دیوانے کی چیخ فضا میں کھو جائے مظلوم روحوں کے اشک خونیں ہیں جن کی نہ وقعت ہے اور نہ کچھ قیمت۔

اور پھر روتا ہوا سمندر مصروف آہ زاری لہریں! پامال سر سبزہ اور افسردہ ساکت پتے۔

مجھے کہنے دو کہ مسرت اس دہر میں کمیاب ہے اور اور سایہ ہما جیسی نایاب۔ تم ہی بتاؤ کہ وہ شے کیونکر حاصل ہو سکتی ہے جس کا کچھ وجود ہی نہیں مسرت! خوشی!! آہ!!!

☆☆☆☆☆

نغمات پر سوز

کتنا دل ریش ہے یہ سانحہ اور کیا پر درد باب!! کہ ایک خواب شیریں سہانا سپنا! شرمندہ تکمیل ہو کر رہ جائے اور تعبیر سے معذور۔

اس سے بڑھ کر بدنصیبی کی اور کیا دلیل ہے کہ کھلنے سے پیشتر ہی کوئی کلی توڑ لی جائے۔ نسیم سحر کے لطیف جھونکوں سے لطف اندوز ہونے سے قبل ہی کچل دیا جائے۔

کتنی قابل رحم ہے وہ آرزو! جو ایک عرصہ سے دل کی گہرائی میں پرورش پاتی رہے اور موقع پا کر پوری ہونے کو مچل رہی ہو لیکن بہ یک جنبش کاتب تقدیر مبدل بہ حسرت ہو کر رہ جائے۔

کس قدر درد انگیز ہے وہ منظر جب زندگی کے تار پر مسرت نغموں کی لے سے جھنجھنانے کو ہوں لیکن کسی آفت ناگہانی سے ٹوٹ کر رہ جائیں۔ فضاؤں میں منتشر ہو جائیں۔

کتنا الم ناک حادثہ ہے اور کیا واقعہ فاجعہ!! کہ جام حیات دھیرے دھیرے پر ہونے لگا ہو لیکن موت کی بے رحم انگلیاں اسے الٹ کر رکھ دیں۔ وقت سے پہلے ہی گلشن حیات کی ننھی کلی کو کاٹ لیں۔

ہر صباح نو آمدہ مجھے رنگین امیدوں کے خواب دکھائے اور خوش رنگ تمناؤں کے غنچے۔

لیکن آہ! کہ ہر آنے والی شام ان میں تہلکہ مچا دیتی جیسے کسی المناک خیال سے چنچل چہرے پر مردنی چھا جائے۔

وہ چمکیلے خواب ماضی کے دھندلکے میں روپوش ہو جاتے اور بڑھتی ہوئی آرزوئیں مرہون حسرت۔

تو کیا ہر خوش آئند خواب، کسک درد جاگداز ہے اور بربادی تمنا ان کا تمہ۔

☆☆☆☆☆

گل خزاں رسیدہ

آفتاب کی روپہلی کرنیں ایک دلفریب انداز سے مسکرا رہی تھیں۔ ننھی ننھی کلیاں آج غنچوں میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ بھونرے انہیں ساکنان چمن سے واقف کر رہے تھے اور تتلیاں فرط مسرت سے چکر کاٹ کاٹ کر رہ جاتیں۔

غنچے مسرور تھے کیونکہ وہ نا آشنائے خزاں تھے اور صیاد کے نام سے بے خبر! نسیم سحر کی معمولی سی جنبش ان پر اک پر کیف لرزش طاری کر دیتی اور عندلیب خوشنوا کی آواز فرط مسرت سے گلرنگ۔

جب ان کے چہار طرف سے مسرت ہی مسرت تھی تو وہ مسرور کیوں نہ ہوتے۔

لیکن انہیں غنچوں میں ایک دہر کے المیہ کا مرقع بھی تھا۔ اس کا جگر فرط الم سے شق تھا اور پنکھڑیاں منتشر۔

آج سے ایک روز پہلے وہ اس چمن کا حسین ترین غنچہ تھا۔ بھونرے اس کے گرد بیتابی سے طواف کرتے اور آفتابی کرنیں بار بار اپنی رفاقت کا احساس دلاتیں۔

لیکن ایک شہد کی مکھی اس کی زندگی کا رس جذب کر چکی تھی۔ خوشبو نہ معلوم کہاں کھو کر رہ گئی تھی اور سرخ و سفید رنگ اب سیاہی میں تبدیل ہو رہا تھا۔

اس کا ننھا سا قلب صد چاک تھا اور روح فضاؤں میں آوارہ۔

اک دوشیزہ ہلکے ہلکے قدم اٹھاتی باغ میں آئی ”کاش! یہ مجھے توڑ لے“ پھول نے دل ہی دل میں کہا۔ ساکنان چمن کی نگاہوں میں کانٹا بن کر کھٹکنے سے تو یہ بہتر ہے کہ حیات کو ہی خیر باد کہہ دیا جائے۔

دوشیزہ کے ہاتھ آگے بڑھے اور پھول فرط اشتیاق سے شاخ پر کانپ رہا تھا۔

لیکن یہ کیا وہ شمعی انگلیاں تو ساتھ والے غنچوں کو توڑ رہی تھیں پھول ٹہنی پر اور بھی جھک کر رہ گیا۔ اس نے اک دلدوز آہ بھری اب دو پنکھڑیاں بھی اس سے علیحدہ ہو چکی تھیں۔

''میری ہستی بے کار ہے۔ غنچہ ہائے نو دمیدہ میں مجھ مردہ دیروز کا کیا کام'' اس نے رنجیدگی سے اک جھرجھری لیتے ہوئے کہا اور ہوا کا شوریدہ جھونکا اس کی باقی پتیوں کو بھی اڑا لے گیا۔

☆☆☆☆☆

IqbalCyberLibrary.Net
All Rights reserved
©2002-2006

جل پریاں

مشرقی جزیروں کے گرد پھیلے ہوئے سمندر کی گہرائیوں میں، جہاں بے شمار موتی ہیں، ایک نوجوان کی لاش پڑی تھی۔ پاس ہی سنہری بالوں والی جل پریاں مرجان زار میں بیٹھی اپنی حسین نیلی آنکھوں سے لاش کی طرف دیکھ دیکھ کر نغمہ آگیں لہجے میں باتیں کر رہی تھیں۔

ان کی گفتگو سمندر نے سنی، موجیں اسے ساحل تک لے گئیں اور وہاں سے ہوا کے لطیف جھونکے مجھ تک پہنچا گئے

ایک بولی:

”یہ آدمی کل اس وقت پانی میں اترا تھا، جب سمندر بپھرا ہوا تھا“

دوسری نے کہا

”سمندر تو بپھرا ہوا نہیں تھا، ہاں! انسان جو اپنے تئیں دیوتاؤں کا جوہر سمجھتا ہے ایک خوفناک جنگ میں مبتلا ہے، جس میں اب تک اتنی خوں ریزی ہو چکی ہے کہ پانی کا رنگ سرخ ہو گیا ہے۔ یہ آدمی اسی جنگ کے مقتولوں میں سے ہے۔“

تیسری نے کہا:

”جنگ ونگ کو تو میں جانتی نہیں، کیا بلا ہے، ہاں! یہ جانتی ہوں کہ انسان نے خشکی پر قبضہ پا لینے کے بعد، حرص کی کہ سمندر پر بھی حکومت کرے، نت نئے آلے بنائے اور ان سے سمندروں کے سیلاب کو کاٹا، جب اس کی اطلاع نجتون پانی کے دیوتا کو ہوئی تو وہ اس دراز دستی پر بہت برہم ہوا، اور انسان کے لئے سوائے قربانی کے کوئی چارہ کار نہ رہا، جس سے وہ ہمارے بادشاہ کو رضامند کر سکتا، وہ مردہ اجسام، جنہیں ہم نے کل پانی میں گرتے دیکھا تھا، نجتون اعظم کے حضور انسان کی آخری قربانی تھے۔“

نجتون کتنا جلیل القدر مگر کتنا سنگ دل ہے، اگر میں جل رانی ہوتی تو کبھی خونی پیش

کشوں سے خوش نہ ہوتی، آؤ اس نوجوان کی لاش کو دیکھیں، ممکن ہے نوع انسانی کے متعلق کوئی بات معلوم ہو جائے!

جل پریاں نوجوان کی لاش کے قریب آئیں اور اس کی جیبیں ٹٹولنے لگیں۔ دل کے قریب جیب کے اندر ایک خط نظر آیا، ایک نے بڑھ کر اسے نکال لیا اور پڑھنے لگی:

رات آدھی گزر چکی ہے اور میں جاگ رہی ہوں، اس عالم کس مپرسی میں اگر کوئی تسلی دینے والا ہے، تو میرے آنسو، یا یہ امید کہ تم جنگ کے چنگل سے نکل کر زندہ سلامت میرے پاس آؤ گے۔

میں اب سوچ بچار کے قابل بھی نہیں رہی، اگر کچھ سوچتی بھی ہوں تو تمہارے وہ الفاظ جو چلتے وقت تم نے مجھ سے کہے تھے ’’ہر انسان کے پاس آنسوؤں کی ایک امانت ہوتی ہے، جو ایک نہ ایک دن واپس کرنی ضروری ہے۔‘‘

پیارے! سمجھ میں نہیں آتا، تمہیں کیا لکھوں؟ اپنے دل ہی کو کیوں نہ کاغذ پر نکال کر رکھ دوں۔

دل جسے بدبختی مبتلائے عذاب کرتی ہے اور درد کو لذت اور غم کو مسرت بنا دینے والی محبت، تسکین دیتی ہے۔

جب محبت نے ہمارے دلوں کو ایک کیا تھا تو ہمیں امید تھی ہمارے جسم آپس میں اس طرح گھل مل جائیں گے کہ ان دونوں میں ایک ہی روح گردش کرے گی۔

اچانک جنگ نے تمہیں پکارا تم ’’فرض‘‘ اور ’’وطنیت‘‘ کے جذبات سے مغلوب ہو کر اس کے پیچھے پیچھے ہو لئے۔

یہ کون سا ’’فرض‘‘ ہے جو وہ محبت کرنے والوں کو جدا کر دے عورتوں کو بیوہ اور بچوں کو یتیم بنا دے؟

یہ کونسی ’’وطنیت‘‘ ہے جو معمولی معمولی باتوں پر شہروں کو تباہ و غارت کرنے کے لئے جنگ برپا کر دے؟

یہ کیسا ''اہم فرض'' ہے جو غریب دیہاتیوں کے لئے ناگزیر ہے مگر طاقت ور اور موروثی شریف زادے اس کی بالکل پرواہ نہیں کرتے؟

اگر ''فرض'' قوموں کی سلامتی کو تباہ اور ''وطنیت'' حیات انسانی کے سکون کو تباہ کر دے تو ایسے فرض اور ایسی وطنیت کو دور ہی سے سلام۔ نہیں، نہیں، میرے حبیب! تم میری باتوں کی پرواہ نہ کرو اور وطن کے لئے زیادہ سے زیادہ بہادری اور جاں نثاری کا ثبوت دو۔ اس لڑکی کی باتوں پر کان نہ دھرو، جسے محبت نے اندھا کر دیا ہے، جس کی عقل پر جدائی نے پردہ ڈال دیا ہے۔ اگر محبت نے تمھیں زندہ سلامت میرے پاس نہیں پہنچایا تو آنے والی زندگی میں، مجھے تم سے ضرور ملا دے گی۔

جل پریوں نے وہ خط نوجوان کی جیب میں اسی طرح رکھ دیا اور غم ناک خاموشی کے ساتھ واپس ہو گئیں تھوڑی دیر جا کر، ان میں سے ایک نے کہا:

''انسان کے دل تو بتوں کے دل سے بھی زیادہ سخت ہے!''

☆☆☆☆☆

محبوبہ

اس وقت تو کہاں ہے؟ اے میری حسینہ!

کیا اپنی چھوٹی سی جنت میں ان پھولوں کا رس چوس رہی ہے، جو تجھ سے محبت کرتے ہیں، جس طرح بچہ اپنی ماں کی چھاتیوں سے محبت کرتا ہے؟ یا اپنے خلوت کدہ میں ہے، جہاں تو نے پاکیزگی کے لئے ایک قربان گاہ بنائی ہے اور میری روح اور اس کی باقی ماندہ قوتوں کو اس پر بٹھا دیا ہے؟ یا اپنی کتابوں میں گم ہے جن کے ذریعہ تو حکمت انسانی سے بڑھ کر، کچھ چاہتی ہے، حالانکہ تو دیوتاؤں کی حکمت سے مالا مال ہے؟

تو کہاں ہے؟ اے میری من موہنی! کیا ہیکل میں میرے لئے عبادت کر رہی ہے؟ یا باغ میں اپنے انوکھے تصورات کی چراگاہ کے متعلق فطرت سے سرگوشیاں کر رہی ہے؟ یا غریبوں کی جھونپڑیوں میں اپنی روح کی حلاوت سے، دل شکستہ لوگوں کو تشفی دے رہی ہے اور اپنے احسان سے ان کی مٹھیاں بھر رہی ہے؟

تو ہر جگہ ہے، اس لئے، اس لئے کہ تو روح خداوندی کا ایک جزو ہے! تو ہر وقت ہے، اس لئے کہ تو زمانہ سے قوی ہے!

کیا تو ان راتوں کو یاد کر رہی ہے، جن میں ہم ایک جگہ جمع ہوئے تھے۔ تیرے نفس کی شعاعیں، ہالہ کی طرح ہمیں گھیرے ہوئے تھیں اور محبت کے فرشتے، روح کے کارناموں کا راگ گاتے ہوئے، ہمارا طواف کر رہے تھے؟

کیا تو ان دنوں کو یاد کر رہی ہے، جن میں ہم شاخوں کے سائے میں بیٹھے اور وہ ہم پر اس طرح سایہ فگن تھیں گویا ہمیں انسان کی نگاہوں سے چھپانا چاہتی ہیں، جیسے پسلیاں دل کے مقدس اسرار کو چھپائے رہتی ہیں؟

کیا تو ان راستوں اور ڈھلانوں کو یاد کر رہی ہے، جن پر ہم چلتے تھے۔ تیری انگلیاں میری انگلیوں سے اس طرح پیوست ہوتی تھیں، جیسے تیری مینڈھیوں کے

بال ایک دوسرے سے پیوست ہیں اور ہم اپنے سر اس طرح جوڑ لیتے تھے، گویا خود کو، خود سے بچانا چاہتے ہیں؟

کیا تو وہ ساعت یاد کر رہی ہے؟ جب میں تجھ سے رخصت ہونے آیا تھا اور تو نے مجھے گلے لگا کر میرا الوداعی بوسہ لیا تھا، جس سے مجھے معلوم ہوا کہ دو چاہنے والوں کے ہونٹ جب آپس میں ملتے ہیں تو ایسے بلند اسرار ظاہر ہوتے ہیں، جنہیں زبان نہیں جانتی۔ وہ بوسہ جو دہری آہ کا پیش خیمہ تھا اور وہ آہ، اس روح سے مشابہ، جسے اللہ نے مٹی میں پھونکا اور اس مٹی سے انسان بن گیا! یہی آہ ہماری عظمت نفس کا اعلان کرتی ہوئی ہمیں روحوں کی دنیا میں لے گئی، جہاں وہ اس وقت تک رہے گی جب تک ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس سے نہ جا ملیں۔

اس کے بعد تو نے مجھے پھر پیار کیا، پھر پیار کیا، پھر پیار کیا اور اس طرح کہ آنسو تجھے سہارا دے رہے تھے، تو نے کہا:

''اجسام کے مقاصد نا قابل اعتناء ہیں، وہ دنیوی معاملات پر قطع تعلق کر لیتے ہیں اور مادی اغراض پر لڑتے جھگڑتے ہیں، لیکن ارواح سکون و اطمینان کے ساتھ محبت کے سائے میں رہتی ہیں، یہاں تک کہ موت آتی ہے اور انہیں خدا کے حضور میں لے جاتی ہیں!''

جا! میرے حبیب! زندگی نے تجھے پکارا ہے، اس کی آواز پر جا!! کیونکہ وہ ایک حسینہ ہے، جو اپنے فرماں برداروں کو، لذت وعشرت کی کوثر کے بھرے ہوئے جام پلاتی ہے! رہی میں، سو میری بالکل فکر نہ کر، کہ تیرا عشق میرے لئے کبھی نہ جدا ہونے والا دولہا ہے اور تیری یاد کبھی نہ ختم ہونے والی مبارک شادی!

اب تو کہاں ہے؟ اے میری رفیقہ حیات! کیا تو رات کی خاموشی میں اس نسیم کے لئے جاگ رہی ہے جو تیری طرف جب کبھی جاتی ہے، میرے دل کی دھڑکنیں اور میرے سینہ کے بھید لے جاتی ہے؟ یا اپنے محبوب کی تصویر کو دیکھ رہی ہے، جو صاحب

تصویر سے بالکل نہیں ملتی، کیونکہ غم نے اس کی پیشانی کو سکیڑ دیا ہے، جو کل تیرے قرب کی وجہ سے کشادہ تھی، گریہ وزاری سے ان آنکھوں کو بے نور کر دیا ہے، جو تیرے جمال کے اثر سے سرمہ آلود تھیں اور دل کی آگ نے ان ہونٹوں کو خشک کر دیا ہے، جو تیرے بوسوں سے تر رہتے تھے۔

تو کہاں ہے؟ اے میری محبوبہ! کیا تو سات سمندر پار سے میری پکار اور نالہ وفریاد سن رہی ہے، میری ذلت و بے چارگی کو دیکھ رہی ہے، میرے صبر وتحمل کا اندازہ کر رہی ہے؟ کیا فضا میں وہ روحیں نہیں ہیں جو ایک درد و کرب سے تڑپتے ہوئے جاں بلب کے الفاظ لے جاتی ہیں؟ کیا روحوں کے درمیان وہ مخفی رشتے نہیں ہیں، جو قریب المرگ عاشق کا شکوہ اس کی محبوبہ تک پہنچا سکیں؟

تو کہاں ہے؟ میری زندگی! ظلمت نے مجھے اپنی آغوش میں کھینچ لیا ہے اور مایوسی مجھ پر غالب آ گئی ہے!!

فضا میں مسکرا کہ مجھ میں حرکت پیدا ہو! ایتھر میں سانس لے کہ میں پھر زندہ ہو جاؤں!!

تو کہاں ہے؟ میری محبوبہ! تو کہاں ہے؟؟

آہ! کتنی عظمت مآب ہے محبت اور کتنا بے بضاعت ہوں میں!!

☆☆☆☆☆

محبت کی کہانی

ایک نوجوان، جس نے ابھی صبح زندگی میں قدم رکھا تھا، اپنے تنہا مکان میں بیٹھا، کبھی کھڑکی میں سے تاروں بھرے آسمان کو دیکھتا اور کبھی نوخیز حسینہ کی تصویر کو، جو اس کے ہاتھ میں تھی تصویر، جس کے خطوط اور رنگ اس کے چہرہ پر منعکس ہو کر، اس عالم کے اسرار اور ابدیت کے رموز کے انکشاف کا سبب بن رہے تھے ایک عورت کے خدوخال کے نقوش، جو اس کی آنکھوں کو کان بنا کر، ان سے سرگوشیاں کر رہے تھے ایسے کان بنا کر، جو اس کمرہ کی فضا میں منڈلاتی ہوئی روحوں کی زبان سمجھتے تھے اور اپنے مجموعی اثر سے ایسے دل و جود میں لا رہے تھے، جو محبت سے روشن تھے اور شوق سے لبریز!

ایک گھنٹہ اس طرح گزر گیا، گویا وہ دلکش خوابوں کا ایک لمحہ ہے یا بقا کی زندگی کا ایک سال۔ نوجوان نے وہ تصویر اپنے سامنے رکھی اور کاغذ و قلم لے کر لکھنا شروع کیا:

”میری روح کی محبوبہ!“

وہ بڑی بڑی حقیقتیں، جو ماورائے فطرت ہیں، عام انسانی کلام کے ذریعہ ایک انسان سے دوسرے انسان کی طرف منتقل نہیں ہوتیں لیکن وہ دو روحوں کے درمیان خاموشی کو اپنے لئے راستہ بنا لیتی ہیں مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ اس رات کی خاموشی ہم دونوں کے درمیان گرم رفتار ہے، اس کے ہاتھ میں وہ خطوط ہیں، جو سطح آب پر موج نسیم کی لکھی ہوئی تحریروں سے زیادہ نرم و نازک ہیں اور وہ ہمارے دلوں کے مکتوب ہمارے دلوں کو پڑھ کر سنا رہی ہے۔

لیکن جس طرح خدا نے چاہا اور روح کو جسم کے قید خانہ میں مقید کر دیا، اسی طرح محبت نے چاہا اور مجھے کلام کا اسیر کر دیا۔

میری محبوبہ! لوگ کہتے ہیں! ”محبت اپنے حلقہ بگوش کے لئے ہلاکت آفریں آگ

بن جاتی ہے۔'' لیکن میں دیکھتا ہوں کہ فراق کی گھڑیاں ہماری ذات معنوی کو جدا کرنے پر قادر نہ ہو سکیں۔ جس طرح پہلی ملاقات کے وقت مجھے ایسا معلوم ہوا تھا کہ میری روح تجھے ہمیشہ سے جانتی ہے اور تیرے چہرہ پر یہ میری پہلی نظر درحقیقت پہلی نظر نہیں ہے۔

میرے دل کی ملکہ! وہ ساعت، جس نے ہمارے دلوں کو عالم علوی سے نکالے ہوئے دلوں کو ایک جگہ جمع کیا، ان چند ساعتوں میں سے ایک ساعت ہے، جس نے نفس کے ازلی اور ابدی ہونے پر میرے اعتقاد کو پختہ کیا۔ اس قسم کی ساعت میں فطرت اپنے انتہائی عدل کے چہرہ سے نقاب اٹھاتی ہے۔ جسے عام طور پر ظلم سمجھا جاتا ہے!

میری پیاری! تجھے وہ باغ یاد ہے، جہاں کھڑے ہو کر ہم اپنے اپنے محبوب کا چہرہ دیکھتے تھے؟ تجھے معلوم ہے! تیری نگاہیں مجھ سے کہتی تھیں کہ تجھے جو محبت مجھ سے ہے، وہ مجھ پر تیری مہربانی کا نتیجہ نہیں ہے؟ وہ نگاہیں جنہوں نے مجھے بتایا کہ میں خود سے اور دنیا والوں سے کہوں: ''وہ عطا، جس کا سرچشمہ عدل و مساوات ہو، اس بخشش سے کہیں بہتر ہے، حسن جو دلکشی پر مبنی ہو، جوہڑوں کے گندے پانی سے مشابہت رکھتی ہے!''

میری جان! میرے سامنے جو زندگی ہے، میں چاہتا ہوں کہ اسے عظمت و جمال کا مرقع دیکھوں۔ وہ ایک ایسی زندگی ہو، جو آنے والے انسان کے تصور سے پیمان اخوت باندھے اور اس کے اعتبار و محبت کی طالب ہو۔ ہاں! میں وہ زندگی چاہتا ہوں جس کا آغاز اس وقت ہوا تھا، جب میں تجھ سے پہلی مرتبہ ملا تھا اور جس کے غیر فانی ہونے کا مجھے کامل یقین ہے۔ اس لئے کامل یقین ہے کہ تیرے وجود کے متعلق میرا یہ ایمان ہے کہ وہ میری اس وقت کو، جو اللہ نے مجھ میں ودیعت کی ہے، مہتمم بالشان اقوال و اعمال کی صورت میں نمایاں کر سکتا ہے، جس طرح سورج باغ کے

خوشبودار پھولوں کو زمین سے نمودار کرتا ہے۔

اپنی ذات اور قوموں سے میری یہ محبت یونہی رہے گی۔ وہ اپنی ہمہ گیری کے لئے اسی طرح انانیت سے پاک اور تجھ سے خصوصیت کی بنا پر اسی طرح ابتذل سے بلند رہے گی۔

نوجوان اٹھا اور آہستہ آہستہ کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس کے بعد اس نے کھڑکی میں سے دیکھا کہ چاند افق کے پیچھے سے طلوع ہو رہا ہے اور فضا اس کی لطیف شعاعوں سے روشن کرتا ہے۔ وہ لوٹا اور اپنے خط میں یہ سطریں بڑھا دیں:

''میری پیاری! مجھے معاف کر! کہ میں نے غیر کی طرح تجھے مخاطب کیا ہے، حالانکہ تو میرا وہ نصف جمیل ہے، جسے میں نے اس وقت کھو دیا تھا، جب ہم دونوں ایک ہی وقت میں دست خداوندی سے نکلے تھے مجھے معاف کر! میری محبوبہ!''

☆☆☆☆☆

حکمت کی زیارت

رات کی خاموشی میں حکمت آئی اور میرے پلنگ کے پاس کھڑی ہوگئی ایک شفیق ماں کی طرح اس نے میری طرف دیکھا اور میرے آنسو پونچھ کر بولی:

"میں نے تیری روح کی پکار سنی اور تیری تشفی کے لئے آ گئی۔ اپنا دل میرے سامنے کھول! تاکہ میں اسے نورلبریز کر دوں۔ میرا دامن تھام! تاکہ میں تجھے حقیقت کا راستہ دکھاؤں۔"

میں نے پوچھا:

"اے حکمت! میں کون ہوں؟ اور اس خوفناک مقام پر کیسے آ پہنچا ہوں؟........ یہ اہم خواہشیں، یہ کثیر التعداد کتابیں اور یہ عجیب وغریب تصویریں کیا ہیں؟........ یہ افکار کیا ہیں، جو کبوتروں کے جھلڑ کی طرح پھڑپھڑاتے گزر جاتے ہیں؟........ یہ کلام کیا ہے، جسے میلان مرتب کرتا اور لذت منتشر کر دیتی ہے؟........ یہ غم آفریں وفرحت نتائج کیا ہیں، جو میری روح سے ہمکنار اور میرے دل کے لئے ہوش ربا ہیں؟........ یہ مجھے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے والی آنکھیں کیا ہیں، جو میری گہرائیوں کو دیکھ رہی ہیں اور میرے آلام کی طرف سے بند ہیں؟........ یہ میری زندگی پر ماتم کرنے والی آوازیں کیا ہیں جو میری بے بضاعتی پر مترنم ہیں؟........ یہ میری تمناؤں سے کھیلنے والا شباب کیا ہے؟ جو میرے جذبات کا مذاق اڑاتا ہے، ماضی کے افعال اعمال کو بھلا دیتا ہے، حال کی بے کیفی پر مسرور ہے اور مستقبل کی سست قدمی پر ناک بھوں سکیڑتا ہے؟........ یہ عالم کیا ہے، جو مجھے ایسی جگہ لے جا رہا ہے، جسے میں نہیں جانتا، اور جو میرے ساتھ مقام ذلت پر کھڑا ہے؟........ یہ زمین کیا ہے، جو اجسام کو نگل جانے کے لئے منہ کھولے ہوئے ہے اور جس نے حرص وطمع کو آباد کرنے کے لئے اپنا سینہ چیر دیا ہے؟........ یہ انسان کیا ہے، جو سعادت وکامرانی کی

محبت پر راضی ہے، حالانکہ اس کی محبت دوزخ کے انتہائی حلقہ تک نہیں پہنچتی، جو بوسہ حیات کا طالب ہے اور موت اس کی منہ پر طمانچے مار رہی ہے، جو لذت کے ایک لمحہ کے لئے ندامت کا ایک سال خرید رہا ہے، جو نیند کے ہاتھ بک چکا ہے اور خواب اسے بلا رہے ہیں، جو نادانی و جہالت کی نہروں کے ساتھ ظلمت کی خلیج کی طرف لے جا رہا ہے؟ .... یہ تمام چیزیں کیا ہیں؟ اے حکمت!"

حکمت نے جواب دیا:

"اے آدم زاد! تو اس دنیا کو اللہ کی آنکھ سے دیکھنا چاہتا ہے، آنے والے زمانے کے بھیدوں کو انسانی فکر کے ذریعہ سمجھنا چاہتا ہے اور یہ حماقت کی انتہا ہے۔ جنگل میں جا! تو شہد کی مکھی کو پھولوں پر بھنبھناتے اور عقاب کو شکار پر منڈلاتے دیکھے گا۔ اپنے ہمسائے کے گھر میں داخل ہو کر دیکھ تو بچہ کو آگ کے شعلوں سے گھبراتے اور ماں کو گھر کا کام کاج کرتے پائے گا۔"

شہد کی مکھی کی مثال ہو جا اور بہار کے دن عقاب کے اعمال دیکھنے میں برباد نہ کر......... بچہ کی مثال ہو جا اور اپنی ماں کو اس کے حال پر چھوڑ کر آگ کے شعلوں سے فرحت حاصل کر!

جو کچھ تو دیکھتا ہے وہ تیرے ہی لئے تھا اور تیرے ہی لئے ہے، یہ کثیر التعداد کتابیں یہ عجیب و غریب تصویریں اور یہ حسین و جمیل افکار، ان لوگوں کی پرچھائیاں ہیں، جو تجھ سے پہلے گزر چکے ہیں۔ یہ کلام، جسے تو مرتب کرتا ہے، تیرے اور تیرے بھائی......... بنی نوع انسان کے درمیان رشتہ اتحاد ہے، یہ غم آفریں اور فرحت بخش نتائج، وہ بیج ہیں، جنہیں ماضی نے روح کے کھیت میں بویا ہے اور جن کا ثمر مستقبل حاصل کرے گا۔

.... یہ تیری تمناؤں سے کھیلنے والا شباب، تیرے دل کے دروازہ کو کھولنے والا ہے تا کہ اس میں نور داخل ہو سکے۔ یہ منہ کھولے ہوئے زمین،

وہ ہے جو تیری روح کو تیرے جسم کی غلامی سے نجات دلائے گی۔ یہ تجھے اپنے ساتھ لے جانے والا عالم تیرا دل ہے اور تیرا دل وہ سب کچھ ہے، جسے تو عالم سمجھتا ہے اور یہ انسان، جو تجھے حقیر و جاہل نظر آ رہا ہے، وہ ہے، جو غم سے خوشی کی ظلمت سے معرفت کی تعلیم حاصل کرنے، ارضِ خداوندی سے آیا ہے..............

حکمت نے اپنا ہاتھ میری بھڑکتی ہوئی پیشانی پر رکھا اور کہا:

”آگے بڑھ اور کہیں منزل نہ کر! کہ آگے بڑھنے کا دوسرا نام کمال ہے.......... بڑھ اور راستہ کے کانٹوں سے نہ ڈر! کہ یہ کانٹے فاسد خون نکالنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے!!“

☆☆☆☆☆

عورت کی عظمت

میں نے ایسا ایک نوجوان دیکھا، جو زندگی کی راہوں میں گم، شباب کے اثرات سے مغلوب اور اپنی خواہشوں کا اصلی سبب معلوم کرنے کے لئے مرا جاتا تھا، ایک نرم و نازک پھول پایا، جسے تند ہوائیں لایعنی تمناؤں کے اتھاہ سمندر کی طرف لٹائے لئے جا رہی تھیں۔

”میں نے اس گاؤں میں ایک شریر لڑکا دیکھا، جو پرندوں کے گھونسلے برباد کر کے ان کے بچوں کو مار ڈالتا تھا، پھولوں کی نازک پنکھڑیوں کو روند کر ان کے حسن و دلکشی کو غارت کر دیتا تھا۔ مدرسہ میں ایک نوجوان پایا، جسے لکھنے پڑھنے سے کوئی سروکار نہ تھا، جو خاموشی کا دشمن اور بدتمیزیوں کی پوٹ تھا، اور شہر میں ایک کڑیل نوجوان دیکھا، جو گھناؤنے بازاروں میں آبائی شرافت کا سودا کرتا پھرتا تھا، ننگ و ذلت کے شبستانوں میں دونوں ہاتھوں سے دولت لٹاتا تھا اور جس نے اونچی عقل بنت زر کے حوالے کر دی تھی۔“

لیکن ان تمام برائیوں کے باوجود میں اس سے محبت کرتا تھا ایسی محبت، جس میں افسوس کے ساتھ ہمدردی شامل تھی۔ میں اسے چاہتا تھا، اس لئے کہ یہ تمام بری عادتیں طبعی نہیں، اس کی کمزور اور مایوس فطرت کا نتیجہ تھیں۔

لوگو! نفس انسانی بجزو اکراہ عقل و حکمت کی راہوں سے ہٹتا ہے اور خوشی خوشی ان کی طرف لوٹتا ہے۔ جوانی کی آندھیاں گرد و غبار کو اپنے دامن میں لے کر اٹھتی ہیں، جو آنکھوں میں گھس کر انہیں بند کر دیتا ہے اندھا کر دیتا ہے، اور بسا اوقات ایک طویل مدت کے لئے اندھا کر دیتا ہے۔

میں اس نوجوان سے محبت کرتا تھا اور میرے دل میں اس کے لئے خلوص بے انتہا خلوص تھا، کیونکہ میں دیکھتا تھا کہ اس کا ضمیر کا کبوتر اس کی بد اعمالیوں کے گدھ پر غالب آنا چاہتا ہے لیکن مغلوب ہو جاتا اپنی بزدلی کی بناء پر نہیں انہیں دشمن کی قوت

کی وجہ ہے!

ضمیر ایک انصاف پسند مگر کمزور قاضی ہے، جس کی کمزوری اس کی حکم جاری کرنے کی راہیں روکے کھڑی ہیں۔

میں نے کہا: میں اس سے محبت کرتا تھا اور محبت مختلف بھیس بدل کر آتی ہے کبھی حکمت کے بھیس میں، کبھی انصاف کے بھیس میں اور کبھی امید کے بھیس میں! مجھے اس سے جو محبت تھی، وہ اس آرزو کے بھیس میں تھی کہ اس کے آفتاب فطرت کی روشنی اس کی عارضی بدعنوانیوں کی ظلمت پر غالب آ جائے، لیکن میں اس سے نا آشنائے محض تھا کہ اس کی آلودگی پاکیزگی سے، بداخلاقی خوش اخلاقی اور جہالت عقلمندی سے کب اور کیوں کر بدلے گی؟ انسان نہیں جانتا کہ روح مادہ کی قید و بند سے کس طرح آزاد ہوتی ہے؟ جب تک وہ آزاد نہ ہو جائے! اسے معلوم نہیں کہ پھول کیوں کر مسکراتے ہیں؟ جب تک ملکہ سحر اپنے روشن چہرہ سے نقاب نہ الٹ دے!

* * *

دن رات کے کندھوں پر سوار ہو کر گزرتے رہے۔ میں اس نوجوان کو رنج والم کے انتہا احساس کے ساتھ یاد کرتا تھا اور ان ٹھنڈے سانسوں کے ساتھ اس کا نام لیتا تھا، جو دل میں زخم ڈال ڈال کر اس کا خون کیے دیتے تھے۔ یہاں تک کہ کل مجھے اس کا ایک خط ملا جس میں لکھا تھا!

”پیارے دوست! میرے پاس آ جاؤ! میں تمہیں ایک نوجوان سے ملانا چاہتا ہوں، جسے دیکھ کر تمہارا دل خوش ہوگا اور جس سے مل کر تمہاری روح مسرور!“

میں نے کہا ”افسوس! کیا وہ یہ چاہتا ہے کہ اپنی دوستی کی غم آفرینیوں کو اپنی ہی جیسی ایک اور دوستی سے گنا کر دے؟ کیا وہ خود ضلالت و گمراہی کے متن کی تشریح و تعریف کے سلسلہ میں کافی مثال نہیں ہے؟ اور کیا اب اس کی خواہش یہ ہے کہ اس مثال پر

اپنے دوستوں کے حالات کا حاشیہ چڑھائے تاکہ ماضی کی کتاب کا کوئی حروف میری نگاہوں سے اوجھل نہ رہ جائے؟"

میرے خیالات کا رخ بدلا: "لیکن مجھے جانا چاہئے! کہ نفس اپنی حکمت سے کام لے کر، کانٹوں سے پھول چن لیتا ہے اور دل اپنی محبت کے بل پر تاریکی کے سینہ سے نور کھینچ لیتا ہے۔"

جب شام ہوئی تو میں اس سے ملنے گیا اور دیکھا کہ وہ اپنے کمرہ میں تنہا بیٹھا، کوئی دیوان پڑھ رہا ہے کتاب اس کے ہاتھ میں دیکھ کر مجھے بہت تعجب ہوا، اور میں نے سلام کر کے اس سے پوچھا:

"وہ نئے دوست کہاں ہیں؟"

اس نے جواب نہ دیا:

وہ خاموشی سے بیٹھا رہا، جو میرے لئے ایک بالکل نئی چیز تھی، اور میری طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں ایک عجیب نور تھا، جو سینہ کو چیر کر جسم کی ہر رگ اور ہر ریشہ کو اپنے حلقہ میں لے رہا تھا۔ وہ آنکھیں، جنہیں میں نے جب دیکھا، درشتی و سنگدلی کے سوا ان میں کچھ نہ پایا، اب ان سے وہ روشنی پھوٹ رہی تھی جو دل کو لطف و مہربانی سے لبریز کئے دیتی تھی۔ آخر کار اس نے ایک ایسی آواز میں، جسے میں یہ سمجھا کہ اس کے حلق سے نہیں، کسی اور کے حلق سے نکال رہی ہے، کہا:

"وہ شخص، جسے تم بچپن میں جانتے تھے، طالب علمی کے زمانہ میں جس کی تم نے رفاقت کی اور جوانی میں جس کے تم ساتھ ساتھ رہے، اب مر چکا ہے اور اس کی موت سے میں پیدا ہوا ہوں۔ میں تمہارا نیا دوست ہوں، مجھ سے ہاتھ ملاؤ!"

میں نے اس سے ہاتھ ملایا اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس کے ہاتھ میں ایک لطیف روح ہے، جو خون کے ساتھ گردش کر رہی ہے وہ سخت اور کھردرا تھا اب نرم و نازک ہو گیا تھا، وہ انگلیاں، جو اپنے اعمال کی بنا پر کل تک چیتے کے پنجہ سے مشابہ تھیں

آض اپنی رقت و لطافت کی بنا پر دل کو مس کر رہی تھیں۔ کاش! میں اپنی بات کی غرابت کا خیال کر سکتا! میں نے اس سے پوچھا! ''تم کون ہو؟ یہ تبدیلی تم میں کیسے اور کہاں پیدا ہوئی؟ کیا روح نے تمہارے جسم کو عبادت کدہ بنا کر تمہیں مقدس کر دیا ہے، یا تم میرے سامنے کسی شاعرانہ دوری کی تمثیل پیش کر رہے ہو؟''

اس نے جواب دیا:

''ہاں! میرے دوست! روح نے مجھ میں نزول فرما کر مجھے پاک کر دیا ہے اور عظیم الشان محبت نے میرے دل کو مقدس قربان گاہ بنا دیا ہے۔ وہ عورت ہے، میرے دوست!''

وہ عورت ہے، جسے کل میں مرد کو کھلانا سمجھتا تھا لیکن آج اس نے مجھے جہنم کی تاریکی سے نکال کر جنت کے دروازے میرے لئے کھول دیئے اور میں اس میں داخل ہو گیا۔

وہ حقیقی عورت، جو مجھے اپنی محبت کے عشرے کدہ میں لے گئی اور میرے لئے سہارا بنی!

وہ عورت جس کی بانہوں کو میں نے اپنی جہالت سے ذلیل کیا، لیکن اس نے مجھے تخت عظمت پر بٹھا دیا۔

وہ عورت، جس کی ہم چشموں کو میں نے اپنی نادانی سے خراب کیا لیکن اس نے اپنی محبت سے مجھے، پاک کر دیا۔

وہ عورت، جس کی ہم جنسوں کو میں نے اپنی دولت سے اپنا غلام بنایا، لیکن اس نے اپنے حسن و جمال کا نور مجھ پر برسا کر مجھے آزاد کر دیا۔

وہ عورت جس نے اپنی قوت ارادی اور آدم کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اسے جنت سے نکلوایا آج اپنی مہربانی اور میری اطاعت کے زیر اثر مجھے اسی جنت میں لے گئی۔

اس وقت میں نے اس کی طرف دیکھا: آنسو اس کی آنکھوں میں چمک رہے تھے مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی اور محبت کی شعاعوں کا تاج اس کے سر پر رکھا تھا۔ میں اس کے قریب گیا اور از راہ برکت طلبی اس کی پیشانی کو بوسہ دیا جس طرح کاہن قربان گاہ کے صحن کو بوسہ دیتا ہے۔ اس کے بعد میں نے اس سے رخصت چاہی اور اس کا یہ فقرہ دل ہی دل میں دہراتا ہوا واپس آ گیا۔ وہ عورت، جس نے اپنی قوت ارادی اور آدم کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اسے جنت سے نکلوایا، آج اپنی مہربانی اور میری اطاعت کے زیر اثر مجھے اسی جنت میں لے گئی۔

☆☆☆☆☆

انسان کی تکمیل

اور خداؤں کے خدا نے اپنی ’’ذات‘‘ سے ایک ’’روح‘‘ علیحدہ کر کے اسے حسن و جمال عطا فرمایا، پھر نسیم سحر کی نرمی، گل ہائے چمن کی خوشبو اور نور قمر کی لطافت۔

اس کے بعد، اسے عشرت کا ایک جام دیا اور کہا:

’’یہ تو اس وقت پینا، جب غم دیروز سے غافل اور ’’فکر فردا‘‘ سے بے نیاز ہو جائے!‘‘

پھر غم کا ایک جام دیا اور کہا:

’’اس کے پینے سے زندگی کی مسرتوں کا راز تیری سمجھ میں آ جائے گا!‘‘

پھر اس میں وہ محبت پیدا کی، جو کم حوصلگی کی پہلی آہ کے ساتھ فنا ہو جاتی ہے، اور وہ رس، جو غرور کے پہلے بول کے ساتھ رخصت ہو جاتا ہے

پھر اس پر آسمانی علم اتارا، جو سچائی کے راستوں کی طرف اس کی رہنمائی کرتی ہے، اس کی گہرائیوں میں ایک بصیرت پیدا کی جو غیر مرئی چیزوں کو دیکھتی ہے اور اس میں ایک جذبہ ودیعت کیا، جو خیالات کے ساتھ بہتا اور تصورات کے ساتھ چلتا ہے۔

پھر اسے تمنا کا لباس پہنایا ہے، جسے فرشتوں نے قوس قزح کی لہروں سے بنا تھا۔

اس کے بعد اس میں حیرت کی تاریکی پیدا کی اور وہ نور کا سایہ ہے!

اور خداؤں کے خدا نے قہر و غضب کی بھٹی سے ’’آگ‘‘ جہالت کے صحراؤں سے ’’ہوا‘‘ اپنائیت کے ساحل سمندر سے ’’ریگ‘‘ اور زمانے کے قدموں تلے سے ’’مٹی‘‘ اور ان سب کے امتزاج سے انسان کو پیدا کیا۔

پھر اسے ایک اندھی قوت عطا کیا، جو ’’جنون‘‘ کے وقت بھڑک اٹھتی اور خواہشوں کے سامنے بجھ جاتی ہے۔

اور کے بعد اس میں زندگی پیدا کی اور وہ موت کا سایہ ہے! خداؤں کا خدا پہلے ہنسا، پھر رو دیا، اس نے محبت کا بے پایاں جذبہ محسوس کیا پھر انسان اور اس کی روح کو آپس میں ملا دیا۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

رفیقہ حیات

پہلی نظر

یہ وہ ساعت ہے، جو زندگی کی بے خبری اور ہوشیاری کے درمیان خط فاصل ہے۔ یہ وہ اولین شعلہ ہے، جو زندگی کی خلاؤں کو روشن کر دیتا ہے۔ یہ سرور قلب انسانی کے پہلے تار کی طلسمی جھنکار ہے۔ یہ وہ مختصر سالمہ ہے، جو گوش روہ میں بیتے ہوئے دنوں کے واقعات دہراتا ہے، اس کی بصارت پر اعمال شب واضح کرتا ہے، اس کی بصیرت کو اس دنیا کے وجدانی کارناموں سے آگاہی بخشتا ہے اور آنے والے عالم کی دائمی زندگی کا راز اس پر فاش کرتا ہے۔ یہ وہ بیج ہے جسے عشروت سے بلندی سے پھینکتی ہے اور آنکھیں دل کے کھیت میں ڈال دیتی ہیں۔ جذبات اس بیج کو سینچتے ہیں اور روح اس کے پھل کھاتی ہے۔

محبوبہ کی پہلی نظر اس روح سے مشابہ ہے، جو اتھاہ سمندر کی سطح پر منڈلایا کرتی تھی اور جس سے زمین و آسمان پیدا ہوئے ہیں۔

رفیقہ حیات کی پہلی نظر خدا کے قول ''کن'' کن مانند ہے!

پہلا بوسہ

یہ اس جام کا پہلا گھونٹ ہے، جسے دیوتاؤں نے محبت کی شراب سے لبریز کیا تھا یہ شک...... جو دل کو بہکا سکھا کر اسے غم گین کرتا ہے............. اور یقین............ جو دل کی خلاؤں کو پر کر کے اسے مسرت بخشتا ہے.......... کے درمیان حد فاصل ہے۔ یہ روحانی زندگی کے قصیدہ کا مطلع اور معنوی انسان کی داستان حیات کا پہلا باب ہے۔ یہ وہ حلقہ ہے، جو ماضی کے دھندلکے کو مستقبل کی روشنی سے ہم رشتہ اور احساسات کی خاموشی کو ان کے نغموں سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ یہ وہ کلمہ ہے جسے چار ہونٹ، دل کے تخت، محبت کے بادشاہ اور وفا کے تاج ہونے کا اعلان کرتے ہوئے ادا کرتے ہیں۔ یہ وہ لطیف لمس ہے،

جو گلاب کی پتیوں پر ہے، نسیم کی انگلیوں کے گزرنے سے مشابہت رکھتا ہے............وہ انگلیاں جن کی گرفت میں طویل و لذیذ آہیں اور مخفی و شیریں کراہیں ہیں۔ یہ ان طلسمی لرزش کا آغاز ہے، جو دو چاہنے والوں کو اس جہان آب و گل سے نکال کر، وحی اور خوابوں کی دنیا میں لے جاتا ہے۔ یہ گل لالہ کا گل انار سے اتحاد، اور ایک تیسرے، نئے وجود کے لئے ان کا باہمی ازدواج ہے۔

اگر پہلی نظر اس بیج سے مماثلت رکھتی ہے، جسے محبت کی دیوی قلب انسانی کے میدان میں ڈالتی ہے، تو پہلا بوسہ شجر حیات کی پہلی شاخ کے کنارے کے، پہلے پھول سے مشابہت رکھتا ہے۔

وصال

یہاں محبت زندگی کے منتشر اجزا کو جمع کرنا شروع کرتی ہے اور مطالب زندگی کے زیر اثر، ان صورتوں کی شکل میں نمو پاتی ہے جنہیں دن خوش آوازی کے ساتھ پڑھ اور راتیں ترنم سے دہراتی ہیں۔

یہاں شوق زمانہ گزشتہ کی چستانوں سے مشکلات کے پردے اٹھاتا ہے اور لذتوں کے اجزاء سے وہ سعادت پیدا کرتا ہے، جس پر کسی کو امتیاز حاصل نہیں، سوائے، نفس کی سعادت کے، جب وہ اپنے پروردگار سے ہم آغوش ہو جائے!

وصال، زمین پر یک تیسری الوہیت کو وجود پذیر کرنے کے لئے دو الوہیتوں کا اتحاد ہے۔ وہ کمزور زمانہ کے بغض و عناد کا مقابلہ کرنے کے لئے، دو طاقتور ہستیوں کا اپنی محبت کے ذریعہ پیمان ہمدوشی ہے وہ قرمزی شراب میں زرد شراب کی آمیزش ہے تاکہ اس سے وہ نارنجی شراب وجود میں آئے، جو شفق صبح کے رنگ سے ملتی جلتی ہے وہ دو روحوں کی نفرت سے نفرت اور دو نفوس کا اتحاد سے اتحاد ہے۔ وہ اس زنجیر کی سنہری کڑی ہے، جس کا پہلا سرا نگاہ ہے اور آخری سرا سرمدیت۔ وہ پاک آسمان سے فطرت کی مقدس زمین پر شفاف بادلوں کی تراوش ہے تاکہ کھیتوں کی مبارک

قوتیں ابھریں۔

اگر محبوبہ کے چہرے پر پہلی نگاہ اس بیج کی مثال ہے، جسے محبت دل کے کھیت میں ڈالتی ہے اور اس کے لبوں کا پہلا بوسہ شاخ حیات کے پہلے پھول کی مانند، تو اس کا وصال پہلے بیج کے پہلے پھول کا پہلا پھل ہے۔

☆☆☆☆☆

IqbalCyberLibrary.Net
All Rights Reserved
©2002-2006

اے ملامت کار

اے ملامت کار! مجھے تنہا چھوڑ دے!

میں تجھے اس محبت کی قسم دیتا ہوں! جو تیری روح کو تیری محبوبہ کے جمال میں جذب کرتی ہے، تیرے دل کو تیری ماں کی شفقت کی زنجیر میں جکڑتی ہے اور تیرے پدرانہ جذبات تیرے بیٹے سے وابستہ کرتی ہے، مجھے میرے حال پر چھوڑ دے!!

مجھ سے اور میرے خوابوں سے کوئی واسطہ نہ رکھ اور کل تک کے لئے صبر کر! کل جو چاہے گا، میرے متعلق فیصلہ کر دے گا!

تو نے نصیحتوں سے اپنا خلوص ظاہر کیا، لیکن نصیحت ایک سایہ ہے جو روح کو حیرت کے سبزہ زار میں لے جاتا ہے، اس مقام کی طرف اس کی رہنمائی کرتا ہے، جہاں زندگی مٹی کی رح جامد ہے!

میرا دل چھوٹا سا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اسے سینہ کی تاریکی سے نکال کر اپنی ہتھیلی پر رکھوں، اور اس کی گہرائیوں کا اندازہ کروں، اس کے اسرار کا کھوج لگاؤں! اس لئے اے ملامت کار! اپنے اعتقادات کے تیروں سے اس کی نگرانی نہ کر! اسے خوف زدہ کر کے پسلیوں کے پنجرہ میں چھپے رہنے پر مجبور نہ کر! جب تک کہ وہ اپنے اسرار کا خون نہ بہا لے، اپنا وہ فرض ادا نہ کر لے جو دیوتاؤں نے، اسے حسن و محبت کی آمیزش سے پیدا کرتے وقت اس کے ذمہ عائد کیا تھا۔

سورج نکل آیا اور بلبل ہزار داستاں چہکنے لگی۔ آس اور مشک کی خوشبوئیں فضا میں پھیل گئیں۔ میں چاہتا ہوں کہ نیند کے لحاف سے نکل کر سفید بھیڑ کے بچوں کے ساتھ چلوں! اس لئے اے ملامت کار! تو مجھے نہ روک! جنگل کے شیروں اور وادی کے سانپوں سے مجھے نہ ڈرا! کہ میری روح خوف کو نہیں جانتی اور کسی برائی سے پیش از وقت نہیں ڈرتی۔

اے ملامت کار! مجھے چھوڑ دے اور نصیحت نہ کر! اس لئے کہ مصائب نے میری

چشمِ بصیرت کو وا کر دیا ہے۔ آنسوؤں نے میری بصارت کو چمکا دیا ہے اور غم نے مجھے دلوں کی زبان دکھادی ہے۔

ممنوعات کا ذکر چھوڑ! کہ میرے ضمیر کی عدالت مجھ پر منصفانہ احکام صادر کرتی ہے۔ اگر میں بے گناہ ہوں گا، تو وہ مجھے سزا سے بچائے گی اور اگر مجرم ہوں گا، تو ثواب سے محروم کر دے گی۔

دیکھ! محبت کا جلوس جا رہا ہے، حسن اپنے جھنڈے بلند کیے اس کے ساتھ ہے اور جوانی خوشی کے بگل بجا رہی ہے!! مجھے نہ روک! اے ملامت کار! بلکہ جانے دے!! کہ راستوں پر گلاب اور چنبیلی کے پھول بچھے ہیں اور فضا مشک کی خوشبو سے بسی ہے۔

دولت کی کہانی اور عظمت کے قصے مجھے نہ سنا! کہ میرا نفس اپنی قناعت کی بنا پر بے نیاز اور دیوتاؤں کی عظمت و بزرگ کی پرستش میں محو ہے!

سیاست کی باتوں اور اقتدار کی خبروں سے مجھے معاف رکھ! کہ ساری زمین میرا وطن اور تمام انسان میرے ہم وطن ہیں۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

بارگاہِ جمال

میں اجتماعی زندگی سے بھاگا اور وسیع وادی میں بھٹکنے لگا۔ کبھی تو میں نہر کے کنارے کنارے چلنے لگتا اور کبھی چڑیوں کی چہکار سننے لگتا، یہاں تک کہ ایک ایسی جگہ پہنچا، جسے گھنے درختوں نے سورج کی نگاہوں سے محفوظ کر رکھا تھا۔ وہاں بیٹھ کر میں اپنی تنہائی سے باتیں اور روح سے سرگوشیاں کرنے لگا اس پیاسی روح سے، جس نے جہاں نظر ڈالی، اس شے کو دیکھا، جو شراب نہیں سراب نظر آتی ہے۔

جب میرا ذہن مادی قیود سے آزاد ہو کر فضائے خیال میں پرواز کرنے لگا تو میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا! ایک نوخیز حسینہ میرے پاس کھڑی تھی وہ نوخیز حسینہ، جو انگور کی شاخوں کے سوا جن سے اس کے جسم کا کچھ حصہ چھپ گیا تھا ہر قسم کے لباس اور زیور سے بے نیاز تھی، جس کے سنہری بالوں کو گل لالہ کے تاج نے سمیٹ رکھا تھا۔

جب اسے میری نگاہوں سے یہ معلوم ہوا کہ میں حیرت کا شکار ہوں تو بولی:

"ڈرو نہیں! میں جنگل کی شہزادی ہوں!"

اس کے لہجے کی شیرینی نے مجھ میں کچھ ہمت پیدا کی اور میں نے کہا:

"کیا تم جیسی حسین شخصیت جنگل میں رہ سکتی ہے، جو تنہائی اور درندوں کا مسکن ہے؟ تمہیں اپنی زندگی کا واسطہ! مجھے سچ سچ بتاؤ! تم کون ہو اور کہاں سے آئی ہو؟"

وہ گھاس پر بیٹھ گئی اور کہا:

"میں فطرت کا راز ہوں! میں وہ دوشیزہ ہوں، جس کی پرستش تمہارے آباؤاجداد کرتے تھے اور جس کے لئے انہوں نے بعلبک، افقا اور جبل میں ہیکل اور قربان گاہیں بنائیں۔"

میں نے کہا۔

"وہ ہیکل مسمار ہو گئے اور میرے اجداد کی ہڈیاں مٹی میں مل ملا گئیں اب ان کے دیوتاؤں اور مذاہب کے نشانات کتابوں کے چند اوراق میں باقی رہ گئے ہیں اور

بس!''

اس نے جواب دیا:

''کچھ دیوتا ایسے ہیں، جو اپنے حلقہ بگوشوں کے ساتھ زندہ رہتے اور انہی کے ساتھ مر جاتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں، جو ازلی و ابدی الوہیت کے ساتھ زندہ رہتے ہیں۔ رہی میری الوہیت، سو وہ اس جمال کی مرہون منت ہے، جسے تو ہر طرف جلوہ فرما دیکھتا ہے وہ جمال جو تمام فطرت کار کے لئے اور پہاڑوں اور ساحلوں کے درمیان خانہ بدوش قبائل کے لئے سعادت کا سرچشمہ ہے۔ وہ جمال، جو حکیم کے لئے عرش حقیقت کا زینہ ہے!''

ایسی حالت میں کہ میرے دل کی دھڑکنیں وہ کچھ کہہ رہی تھیں، جس سے زبان نا آشنائے محض ہے، میں نے کہا:

''بیشک جمال ایک قوت ہے، خوفناک اور ڈراؤنی!''

اس کے ہونٹوں پر پھولوں کا تبسم تھا اور نگاہوں میں زندگی کے اسرار اس نے کہا:

''تم انسان ہر چیز سے ڈرتے ہو، یہاں تک کہ اپنی ذات سے بھی۔ تم آسمان سے ڈرتے ہو، حالانکہ وہ امن و سلامتی کا سرچشمہ ہے، فطرت سے ڈرتے ہو، حالانکہ وہ اطمینان و راحت کا گہوارہ ہے، خداؤں کے خدا سے ڈرتے ہو اور عداوت و غضب کو اس کی ذات سے منسوب کرتے ہو حالانکہ وہ اگر محبت و رحمت نہیں ہے تو کچھ نہیں ہے!''

تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد، جس میں لطیف خواب گھلے ملے تھے۔ میں نے اس سے پوچھا:

''یہ جمال کیا ہے؟ کیونکہ لوگ تو اس کی تعریف و جدید میں مختلف الرائے ہیں بالکل، اسی طرح، جیسے اس کی محبت و تکریم میں!''

اس نے جواب دیا:

”جمال وہ ہے، جس کی طرف تو خود بخود کھنچے جسے دیکھ کر تو اسے دینا چاہے اس سے لینا نہ چاہے جسے اجسام مصیبت اور ارواح عطیہ سمجھیں جو رنج کے درمیان رشتہ اتحاد ہو جو تو روپوشی میں جلوہ فرما دیکھے، لاعلمی میں آشنا پائے اور خاموشی میں بولتے سنے جو ایک قوت ہے، جس کا آغاز تیری ذات کی انتہائی پاکیزگی سے ہوتا ہے۔ اور انتہا اس نقطہ پر، جو تیرے تصورات سے ماوراء ہے۔“

جنگل کی شہزادی میرے قریب آئی اور اپنا معطر ہاتھ میرے آنکھ پر رکھ دیا، جب اس نے اپنا ہاتھ میری آنکھ سے ہٹایا تو میں نے خود کو اس وادی میں تنہا پایا۔ میں وہاں سے لوٹ آیا، دل ہی دل میں کہتا ہوا، اور بار بار کہتا ہوا:

”جمال وہ ہے، جسے دیکھ کر تو اسے دیکھنا چاہے، لینا نہ چاہے!“

☆☆☆☆☆

ملاقات

جب رات آسمان کے لباس کے جوہر ٹانک چکی، تو وادی نیل سے ایک پری، اپنے غیر مرئی پروں کو پھڑپھڑاتے ہوئے بلند ہوئی اور بحر روم پر چھائے ہوئے ان بادلوں کے تخت پر بیٹھ گئی جو چاند کی شعاعوں سے نقرئی معلوم ہو رہے تھے۔ فضا میں تیرتی ہوئی روحوں کا ایک جھکڑ اس کے سامنے سے گزرا جو بلند آواز میں کہہ رہا تھا:

"پاک ہے! پاک ہے! پاک ہے! مصر کی وہ بیٹی، جس کی عظمت سارے خطہ ارض کو محیط ہے!!"

اس چشمہ کے منبع کی بلندیوں سے، جو صنوبری جھنڈ کو گھیرے ہوئے تھا، ایک نوجوان کا سایہ ساروفیم کے ہاتھوں میں لپٹا ہوا، ابھرا اور پری کے پہلو میں تخت پر بیٹھ گیا۔ روحیں پھر آئیں اور یہ چلاتی ہوئی ان کے سامنے سے گزر گئیں!

"پاک ہے! پاک ہے! پاک ہے، لبنان کا وہ نوجوان، جس کی بزرگی سے زمانہ لبریز ہے!!"

جب عاشق نے محبوبہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں تو موجوں اور ہواؤں نے ان کی اس سرگوشی کو دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہنچا دیا۔

"ایسس کی بیٹی! تیرا حسن کس قدر مکمل ہے، اور میری محبت کتنی بے پناہ!"

"عشروت کے بیٹے! تو نوجوانوں میں کتنا حسین ہے، اور میرا جذبہ شوق کس درجہ وافر!"

"میری محبت تیرے اہرام کی مثال ہے میری محبوبہ! جسے زمانہ مسمار نہیں کر سکتا!"

اور میری محبت تیرے صنوبر کے درختوں سے مشابہ ہے، میری حبیب! جس پر عناصر غلبہ نہیں پا سکتے!

"مختلف اقوام کے فلسفی مشرق و مغرب سے آتے ہیں؟ میری محبوبہ! تاکہ تیری حکمت سے نفع اندوز ہوں اور تیرے اسرار و رموز معلوم کریں۔"

''دنیا کی بڑی بڑی ہستیاں مختلف ملکوں سے وارد ہوتی ہیں میرے حبیب! تاکہ تیرے جمال کی شراب سے مخمور اور تیرے معانی سے طلسم اور مسحور ہوں!''

''میری پیاری! تیری ہتھیلی ان بے شمار نیکیوں کا کھیت ہے، جن سے مووی خانے بھرے جاتے ہیں۔''

''میرے پیارے! تیرے بازو شیریں پانی کا سرچشمہ ہیں اور تیری سانس نشاط آفریں ہوائیں!''

''نیل کے محل اور ہیکل، میری پیاری! تیری عظمت کا ڈنکا بجاتے ہیں اور ابوالہول تیری بزرگی کی داستان سناتا ہے!''

''تیری چھاتی کے یہ صنوبری درخت، میری پیارے! تیری شرافت ونجابت کی نشانیاں ہیں اور تیرے گردوپیش کے یہ قلعے تیری عظمت وشجاعت کے ترجمان!''

''آہ! میری محبوبہ! کتنی حسین ہے تیری محبت! اور کتنی شیریں ہے وہ امید، جو تیرے ارتقا سے وابستہ ہے!!''

''آہ تو کتنا محترم دوست اور کتنا وفادار شوہر ہے۔ تیرے تحفے کتنے حسین اور تیری بخششیں کتنی نفیس ہیں! تو نے میرے پاس ان نوجوانوں کو بھیجا، جو گہری نیند کے بعد کی بیداری تھے۔ تو نے مجھے تحفہ میں وہ شہسوار عطا کیا، جو میری قوم کی کمزوری پر غالب آ گیا۔ تو نے ہدیہ کے طور پر مجھے وہ ادیب دیا جس نے میری قوم کو بیدار کیا اور وہ نجیب مرحمت فرمایا، جس نے اس کی غیرت قومی کو بھڑکایا''

''میں نے تیرے پاس بیج بھیجے اور تو نے انہیں پھول بنا دیا، میں نے تیرے پاس پودے بھیجے اور تو نے انہیں درخت بنا دیا۔ تو وہ اچھوتا باغ ہے، میری پیاری! جو گلاب اور سوسن میں جان ڈالتا ہے سرو اور صنوبر کو بلندی عطا کرتا ہے!''

''مجھے تیری آنکھوں میں غم نظر آ رہا ہے، میرے حبیب! کیا تو میرے پہلو میں ہوتے ہوئے بھی غمگین ہے؟''

”میرے پیارے! کاش! مجھے بھی تیرے ہی جیسا غم مل جاتا اور خوف و ہراس کا کوئی اثر میرے دل پر باقی نہ رہتا!“

”نیل کی بیٹی! کیا قوموں کی پیاری ہوتے ہوئے بھی خوف زدہ ہے؟“

”میں اس شیطانی جماعت سے ڈرتی ہوں، جو اپنی مکاریوں کی ملاوٹ کے ذریعے میرے قریب آ رہی ہے، جو اپنے بازوؤں کی قوت سے میرے باگیں سنبھال رہی ہیں!“

”اقوام کی زندگی میری پیاری! افراد کی زندگی سے مشابہ ہے اس زندگی سے، جسے امید عزیز رکھتی ہے، جس سے خوف قریب تر ہے، جس کے گرد آرزو منڈلاتی ہیں اور جس پر مایوسی نگاہیں جمائے رہتی ہے!“

محب و محبوب ہم آغوش ہو گئے اور بوسوں کے پیالوں میں معطر شراب پینے لگے۔

اسی دوران میں روحوں کا جھلڑ گاتے ہوئے گزرا:

”پاک ہے! پاک ہے! پاک ہے! وہ محبت، جس کی عظمت و بزرگی نے زمین و آسمان کو گھیر رکھا ہے۔“

☆☆☆☆☆

قبرستان

کل میں شہر کے ہنگاموں سے اکتا کر، پرسکون سبزہ زاروں میں ٹہلنے کے لئے نکلا، ایک بلند پہاڑی پر پہنچ کر، جسے فطرت نے حسین ترین لباس پہنا رکھا تھا، ٹھہر گیا۔ شہر اپنی ساری بلند عمارتوں اور عالی شان محلوں کے ساتھ، کارخانوں کے دھوئیں کے کثیف بادل میں دبا ہوا نظر آ رہا تھا۔

میں بیٹھ گیا اور دور سے انسان کی عملی زندگی کا جائزہ لینے لگا۔ مجھے وہ سرتاپا ”مشقت“ نظر آئی۔ میں نے اپنے دل میں فیصلہ کرلیا کہ اب انسان کی اس بناوٹی زندگی پر غور نہ کروں گا اور اپنا رخ اس سبزہ زار کی طرف کرلیا، جو عظمت خداوندی کی جلوہ گاہ تھی۔ میں نے دیکھا! اس سبزہ زار کے وسط میں ایک قبرستان ہے، جس کی مرمریں قبریں سرو کے درختوں سے گھری ہوئی نظر آ رہی ہیں۔ وہاں زندوں اور مردوں کی بستی کے درمیان میں ایک بستی کی مسلسل کش مکش اور دائمی حرکت اور دوسری بستی پر چھائی ہوئی خاموشی اور مستقل سکون کے متعلق بیٹھا سوچ رہا تھا۔

ایک طرف امیدیں تھیں اور ناامیدیاں، محبت تھی اور نفرت، امیری تھی اور غریبی، اعتقاد اور بے اعتقادی!

اور دوسری طرف مٹی میں مٹی تھی، جس کے باطن کو ظاہر سے بدل کر، فطرت سے سے نباتات، پھر حیوانات پیدا کرتی ہے اور یہ سب کچھ رات کی خاموشی میں ہو جاتا ہے۔

میں اپنے انہیں افکار میں گم تھا کہ میری توجہ ایک آہستہ رو، جم غفیر نے اپنی طرف مبذول کرلی۔ آگے آگے بینڈ تھا۔ جس کے غم انگیز نغموں سے فضا پر اداسی چھا گئی تھی یہ ایک بہت بڑا ہجوم تھا جس میں عظمت و اقتدار کے دیوتا شامل تھے، ایک عظیم المرتبت رئیس کا جنازہ تھا ایک مردہ کی ہڈیاں تھیں، جس کے پیچھے پیچھے زندہ لوگ روتے، واویلا مچاتے اور فضا کو اپنے نالہ و ماتم سے گراں بار کرتے، چلے آ رہے

تھے۔

جنازہ قبرستان پہنچا۔ پادری جمع ہوئے اور عود و لوبان سلگا کر مردہ کے حق میں دعائے مغفرت کی۔ ادھر بینڈ بجانے والوں نے ایک طرف ہو کر غم کا بینڈ بجایا۔ اس کے بعد خطیب آگے بڑھے اور نہایت فصیح و بلیغ الفاظ میں مرنے والے پر ماتم کیا، پھر شاعروں نے اپنے اپنے مرثیے پڑھے، جن میں سوز و گداز کے ساتھ ساتھ معنوی اطافتیں بھی تھیں۔ یہ سب کچھ اکتا دینے والے طوالت کے بعد ختم ہوا، اور مجمع رفتہ اس قبر سے رخصت ہو گیا، جس کے بنانے میں گورکنوں اور انجینئروں نے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کی تھی اور جس پر ہنرمند ہاتھوں کے گوندھے ہوئے ہار پڑے تھے۔

لوگ شہر کی طرف واپس چلے گئے، لیکن میں دور سے یہ سب کچھ دیکھتا اور اس پر غور کرتا رہا۔ سورج ڈھل چکا تھا، چٹانوں اور درختوں کے سائے طویل ہو گئے تھے اور فطرت نے نور کا لباس اتارنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے نگاہ اٹھائی اور دیکھا دو آدمی ایک لکڑی کا تابوت اپنے کندھوں پر لئے چلے آ رہے ہیں۔ ان کے پیچھے پیچھے ایک عورت ہے، جس کے جسم پر پھٹے پرانے کپڑے، گود میں ایک دودھ پیتا بچہ اور پہلو میں ایک کتا ہے، جو کبھی اس کی طرف دیکھتا ہے اور کبھی تابوت کی طرف

یہ ایک مفلس کا جنازہ تھا، جس کے پیچھے ایک اس کی بیوی تھی، جو یاس و نومیدی کے آنسو بہا رہی تھی، ایک اس کا بچہ تھا، جو اپنی ماں کو روتے ہوئے دیکھ کر رو رہا تھا، اور ایک اس کا وفادار کتا، جس کی رفتار سے اس کے رنج و غم کا اظہار ہوتا تھا۔

یہ لوگ قبرستان پہنچے اور تابوت کو ایک قبر میں اتار دیا، جو مرمریں قبروں سے بہت دور ایک گوشہ میں تھی۔ اس کے بعد وہ پر اثر خاموشی کے ساتھ واپس ہوئے، کتا بار بار اپنے آقا کی آخری آرام گاہ کو دیکھ رہا تھا، یہاں تک کہ وہ سب درختوں میں روپوش ہو گئے۔

اس وقت میں نے شہر کی طرف دیکھ کر اپنے دل میں کہا:

”یہ دولت اور قوت والوں کے لئے ہے!“

پھر قبرستان کی طرف متوجہ ہو کر کہا:

”اور یہ بھی دولت اور قوت والوں کے لئے ہے!! پھر کمزوروں اور غریبوں کا وطن کہاں ہے؟ میرے معبود!“

یہ کہہ کر میں نے تہ بہ تہ بادلوں کی طرف دیکھا، جن کے کنار سورج کی حسین شعاعوں سے سنہرے ہو گئے تھے۔ میرے دل سے آواز آئی:

”وہاں............“

☆☆☆☆☆

ملکہ خیال

میں تدمر (1) کے کھنڈروں میں پہنچا اور تھک کر گھاس پر بیٹھ گیا، جو ان ستونوں کے درمیان اگی ہوئی تھی، جنہیں زمانہ نے اکھیڑ کر، گڑھوں میں پھینک دیا تھا اور جو ایسے معلوم ہوتے تھے، گویا کسی خوفناک جنگ میں کام آنے والے سپاہیوں کے ڈھانچے ہیں۔ میں اس شہر کی بڑی بڑی عمارتوں کی تباہی پر غور کرنے لگا، جو صحیح وسالم اور سرسبز آثار سے الگ مسمار ہوئی پڑی تھیں۔

جب رات ہوئی اور مختلف الجنس مخلوقات نے خاموشی کا لباس پہننے میں ساجھا کر لیا تو میں نے محسوس کیا کہ ایتھر میں جو میرا احاطہ کئے ہوئے ہے، ایک سیال ہے، جو خوشبو میں عود ولوبان سے اور فعل میں شراب سے مشابہ ہے۔ کسی نہ معلوم قوت کے زیر اثر، میں نے اسے پینا شروع کر دیا اور مجھے ان مخفی ہاتھوں کا احساس ہوا، جو میری عقل کو بانٹ رہے تھے، میری آنکھوں کو بند کئے دیتے تھے اور میری روح کو اس کی بندشوں سے آزاد کر رہے تھے۔ اس کے بعد زمین میں تناؤ کی سی اور فضا میں لرزش کی سی کیفیت پیدا ہوئی۔ ایک طلسمی قوت سے مغلوب ہو کر میں نے جست لگائی اور خود کو ایک ایسے باغ میں پایا، جس کا تصور بھی انسان کی قدرت سے باہر ہے، میرے ساتھ نوخیز لڑکیوں کا جھمگٹ تھا، جن کا جسم، حسن کے سوا ہر لباس سے عاری تھا۔ جو میرے گرد وپیش میں مصروف خرام تھیں لیکن ان کے پاؤں گھاس سے مس نہ ہوتے تھے۔ جو نغمہ عبودیت الاپ رہی تھیں، جس کی ترکیب محبت کے خوابوں سے ہوئی تھی اور ہاتھی دانت کے سرود بجا رہی تھیں، جن کے تار سنہری تھے۔ ایک کشادہ مقام پر پہنچ کر، جس کے وسط میں جڑاؤ تخت بچھا تھا اور چاروں طرف وہ نظر فریب سبزہ زار تھے، جن سے قوس وقزح کے رنگ کی روشنیاں پھوٹ رہی تھیں۔ وہ لڑکیاں دائیں بائیں کھڑی ہو گئیں، ان کی آوازوں میں مقابلتاً بلندی پیدا ہو گئی اور وہ اس سمت دیکھنے لگیں جہاں عود اور لوبان کی لپیٹیں چلی آ رہی تھیں۔ اچانک پھولوں

سے لدی ہوئی شاخوں میں سے ایک ملکہ نمودار ہوئی۔ جو آہستہ آہستہ تخت کی طرف آ رہی تھی۔ تمکنت اور وقار کی ایک عجیب شان سے وہ تخت پر جلوہ افروز ہوئی اور برف کی مانند سفید کبوتروں کا ایک جھلڑ آسمان سے اتر کر اس کے قدموں میں بہ شکل ہلال بیٹھ گیا۔

یہ سب کچھ ہوا، اس حال میں دوشیزہ گان جمال ملکہ کی عظمت کی راگ گا رہی تھیں اور عود ولوبان کو دھواں اس کی تکریم وتعظیم کے لئے ستونوں کی طرف اٹھ رہا تھا۔ میں حیرت واستعجاب کا مارا ملکہ کے سامنے کھڑا، وہ کچھ دیکھ رہا تھا، جو انسان کی آنکھ نے کبھی نہیں دیکھا اور سن رکھا تھا، جس سے ابن آدم کے کان کبھی آشنا نہیں ہوئے۔

ملکہ نے ہاتھ کا اشارہ کیا اور ہر حرکت سکون سے بدل گئی اس کے بعد ایک ایسی آواز میں، جو میری روح کو اس طرح حرکت میں لے آئی، جس طرح موسیقار کا ہاتھ عود کے تاروں کو حرکت میں لے آتا ہے اور جس نے اس طلسمی دائرہ وک اس طرح متاثر کر دیا، گویا ہر شے سراپا گوش وقلب ہے، اس نے کہا:

”اے آدم زاد! میں نے تجھے بلایا ہے، کہ میں خیال کی نزہت گاہوں کی پروردگار ہوں!! میں نے تجھے اپنے حضور طلب کیا ہے! کہ میں خوابوں کے جنگل کی ملکہ ہوں!! میری باتیں غور سے سن کر انہیں اپنے ہم جنسوں کے سامنے بلند آواز میں دہرائیو!“

کہیو! خیال کی مملکت، خانہ شادی ہے، جس کی دربانی ایک سرکش دیو کرتا ہے، اس مکان میں کوئی داخل نہیں ہو سکتا، جب تک کہ شادی کا لباس پہنے ہوئے نہ ہو۔

کہیو! وہ ایک جنگ ہے، جس کی حفاظت محبت کے فرشتے کرتے ہیں۔ اس جنت کو وہی دیکھ سکتا ہے، جس کی پیشانی پر محبت کا نشان ہو! وہ تصورات کا ایک باغ سر سبز باغ ہے، جس کی نہریں شراب کی طرح خوشگوار ہیں، جس کے پرند فرشتوں کی طرح اڑتے ہیں اور جس کے پھولوں سے مشک وعنبر کی خوشبوئیں پھوٹتی ہیں۔ اس

باغ میں خیال پرست کے علاوہ کوئی قدم نہیں رکھ سکتا۔

انسان سے کہیو! کہ میں نے اسے سرور سے بھرا جام عطا کیا لیکن اس نے اپنی جہالت کی وجہ سے اسے انڈیل دیا، یہ دیکھ کر ظلمت کا فرشتہ آیا اور اس جام کو افسردہ غم سے لبریز کر گیا، وہ بدنصیب اسے پی گیا اور مدہوش و بے خبر ہو گیا۔

کہیو! کہ سرور زندگی کو چھیڑنا صرف انہی لوگوں کا کام ہے، جن کی انگلیوں نے میرے دامن کو چھوڑا ہے اور جن کی آنکھوں نے میرے تخت کو دیکھا ہے، چنانچہ اشعیا نے اپنے حکمت کے موتی میری محبت کے رشتہ میں پروئے ہیں، یوحنا نے اپنا خواب میری زبان سے بیان کیا ہے اور دانتے نے عالم برزک کی راہیں میری رہنمائی میں طے کی ہیں میں وہ مجاز ہوں جس کے ڈانڈے حقیقت سے ملتے ہیں، وہ حقیقت ہوں، جو روح کی وحدانیت کا اظہار کرتی ہیں اور وہ شاہد ہوں، جس سے دیوتاؤں کے اعمال میں حسن و پاکیزگی پیدا ہوتی ہے۔

کہیو! فکر کے لئے اس مادی عالم سے بلند اور عالم ہے، جس کے آسمان کے سرور کے بادل مکدر نہیں کرتے اور تخیلات کے لئے، دیوتاؤں کے آسمان پر بنی ہوئی کچھ تصویریں ہیں، جن کا عکس روح کے آئینہ پر پڑتا ہے، ان عشرتوں کی امید کو عام کرنے کے لئے، جو اسے دنیوی زندگی سے چھٹکارا پانے کے بعد، حاصل ہوں گی۔

ملکہ خیال نے سحر آفریں نگاہوں سے مجھے اپنی طرف کھینچا اور میرے پھڑکتے ہوئے ہونٹوں کو بوسہ دے کر کہنے لگی:

”کہیو! کہ جو کوئی اپنے شب و روز خیال و خواب کی دنیا میں بسر نہیں کرتا وہ شب و روز کا غلام رہتا ہے۔“

اس وقت دوشیزگان جمال کی آوازیں اونچی ہوئیں، عود و لوبان کا دھواں بلند ہوا اور خواب میری نگاہوں سے چھپ گیا۔ زمین میں تناؤ کی سی اور فضا میں لرزش کی سی

کیفیت پیدا ہوئی۔ اب میں پھر انہیں غم آفریں کھنڈروں میں تھا۔

صبح مسکرا رہی تھی اور میری زبان اور ہونٹوں پر یہ کلمے تھے:

”جو کوئی اپنے شب و روز خیال و خواب کی دنیا میں بسر نہیں کرتا وہ شب و روز کا غلام رہتا ہے!“

☆☆☆☆☆

1۔ تدمر: شام میں قدیم دور کا ایک شہر

IqbalCyberLibrary
2002-2006

زندگی

زندگی نے مجھے جوانی کے پہاڑ کے دامن میں کھڑا کر دیا اور پیچھے کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو ایک عجیب و غریب وضع کا شہر نظر آیا، جو ایک ہموار زمین کی چھاتی پر آباد تھا۔ اس شہر میں مختلف قسم کی پرچھائیاں اور رنگ برنگ کے بخارات گردش کر رہے تھے اور اس پر ایک ایسی لطیف کہر کی نقاب پڑی تھی جو قریب تھا کہ اسے نگاہوں سے اوجھل کر دیتی۔

میں نے پوچھا:

”زندگی! یہ کیا ہے“

اس نے کہا:

”غور سے دیکھو! یہ دیارِ ماضی ہے!“

میں نے غور سے دیکھا تو مجھے نظر آیا: اعمال کے مدارس نیند کے بازوؤں تلے، دیووں کی طرح بیٹھے ہیں۔ اقوال کی مسجدیں مایوسی کی چیخیں مارتی اور امید کے راگ گاتی اس کا طواف کر رہی ہیں۔ مذہب کے ہیکلوں کو کبھی یقین تعمیر کرتا ہے اور کبھی شک و ارتیاب ڈھا دیتا ہے۔ افکار کے مینار آسمان کی طرف اس طرح بلند ہیں، گویا بھیک منگوں کے ہاتھ ہیں۔ امیدوں کے راستے اس طرح پھیلتے چلے گئے ہیں جیسے ٹیلوں کے درمیان دریا۔ اسرار کے خزانے، جن کی حفاظت، رازدار کر رہی تھی شوق دریافت کے ڈاکوؤں نے لوٹ لئے ہیں۔ سبقت و پیش قدمی کے قلعوں میں، جنہیں شجاعت نے بنایا تھا خوف و ہراس نے شگاف ڈال دیئے ہیں۔ خوابوں کے محل، جنہیں راتوں نے سجا دیا تھا، بیداری نے ویران کر دیئے ہیں، چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں، کمزور کا مسکن ہیں، تنہائی کی یونیورسٹیوں میں افکارِ ذات براجمان ہے، علوم و فنون کی محفلیں جنہیں عقل نے روشن کیا تھا، جہل کے ہاتھوں تاریک ہو گئی ہیں، محبت کے شراب خانوں میں عاشق بے ہوش پڑے ہیں اور غفلت و بے خبری کا

مذاق اڑا رہی ہے۔ انسانی عمر کے اسٹیج پر ”جو کبھی زندگی کے ڈراموں کی نمائش کے لیے وقف تھا، موت نے آ کر اپنی ٹریجیڈی ختم کر دی ہے!“

یہ دیارِ ماضی ہے، جو دور بھی ہے اور نزدیک بھی نگاہوں کے سامنے بھی ہے اور ان سے روپوش بھی۔

زندگی نے قدم اٹھایا اور کہنے لگی:

”بس اب اٹھو! بہت دیر ہو گئی!!“

میں نے پوچھا!

زندگی! اب کہاں کا ارادہ ہے؟

اس نے جواب دیا:

”مستقبل کے شہر کا!“

میں نے درخواست کی:

”تھوڑی دیر اور تھم جا! کہ میں چلتے چلتے تھک گیا ہوں، چٹانوں نے میرے پاؤں کو زخمی اور دشوار گزار راستوں نے میری قوتوں کو مضمحل کر دیا؟“

زندگی نے جھنجھلا کر کہا:

”اٹھ اور چل ٹھہرنا بزدلی ہے اور دیارِ ماضی کو دیکھنا جہالت!“

☆☆☆☆☆

خانقاہ

دو آدمی ایک ساتھ وادی میں گھوم پھر رہے تھے۔

ان میں سے ایک نے پہاڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

’’وہ سامنے خانقاہ دیکھ رہے ہو! اس میں ایک راہب رہتا ہے۔ جس نے مدتوں سے دنیا کو تج رکھا ہے۔ اسے صرف خدا کی تلاش ہے۔ اور دنیا کی کسی اور چیز سے اسے رغبت نہیں ہے۔ دوسرا بولا‘‘

’’جب تک وہ اس خانقاہ، اور اس خانقاہ کی تنہائی کو چھوڑ کر دنیا میں واپس نہیں آتا۔ خوشی میں ہمارا ساتھی اور غمی میں ہمارا مونس بننے کے لئے شادی کی محفلوں میں ناچنے والوں کے ساتھ مل کر ناچنے اور موت کے سانحوں پر، رونے والوں کے ساتھ آنسو نہ بہائے، اسے خدا نہیں مل سکتا!‘‘ پہلا اگرچہ دل میں قائل ہو چکا تھا کہنے لگا۔

’’تم نے جو کچھ بھی کہا مجھے اس سے اتفاق ہے۔ لیکن پھر بھی، یہ میرا ایمان ہے کہ راہب بہت اچھا آدمی ہے اور کیا یہ بہتر نہیں ہے۔ کہ ایک بھلا آدمی ہزاروں ایسے لوگوں سے دور ہی رہے جو اپنے آپ کو بھلا سمجھتے ہیں۔‘‘

☆☆☆☆☆

بھوتوں کا بسیرا

تین آدمی دور کھڑے اس سفید مکان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جو سامنے پہاڑ کی چوٹی پر واقع تھا۔

ان میں سے ایک نے کہا۔

”یہ خاتون روحی کا گھر ہے، اس بوڑھی چڑیل کا!“

”اماں تم کیا جانو“ دوسرا بولا ”خاتون روحی تو بلا کی خوبصورت عورت ہے۔ جو دن رات اپنے خوابوں کے سحر میں کھوئی رہتی ہے!“

”تم دونوں غلط کہتے ہو“ تیسرے نے کہا ”خاتون روحی تو ان وسیع کھیتوں کی مالک ہے۔ اور سفاک زمینداروں کی طرح اپنے کسانوں کا خون چوستی ہے!“

وہ خاتون روحی کے متعلق باتیں کرتے بڑھتے چلے گئے!

جب چوراہے پر پہنچے۔ تو انہیں ایک بوڑھا ملا۔ ان میں سے ایک نے اس سے کہا۔

”کیا آپ خاتون روحی کے متعلق کچھ فرما سکتے ہیں؟ جو پہاڑی کے اس سفید مکان میں رہتی ہے!“

”بوڑھے نے مسکراتے ہوئے اپنا سر اٹھایا“ میں نوے (90) سال کا ہو گیا ہوں۔ بھائی، اور خاتون روحی کے متعلق اس زمانے سے سنا کرتا تھا۔ جب میں بھی چھوٹا سا بچہ تھا۔ خاتون روحی کو مرے اسی (80) سال گزر چکے ہیں اور وہ گھر جب سے خالی پڑا ہے۔ ہاں کبھی کبھی الو بولتے ضرور سنائی دیتے ہیں۔ اور لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ وہاں بھوتوں کا بسیرا ہے!

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

یہ دنیا ہے!

آج سے ان گنت سال پہلے ایک راہب رہتا تھا۔ وہ مہینے میں تین بار شہر جاتا اور چوک میں کھڑے ہو کر لوگوں کو باہمی اشتراک و بخشش کی نصیحت کرتا، اس کے بیان میں زور تھا اور زبان میں اثر دور دور تک اس کی دھوم تھی!

ایک شام تین آدمی اس کی کٹیا میں آئے، اس نے ان کا خیر مقدم کیا وہ بولے۔

''آپ باہمی اشتراک و بخشش کی نصیحت کرتے ہیں۔ آپ نے ان لوگوں کو جن کے پاس ضرورت سے زیادہ ہوتا ہے۔ غریبوں سے مروت کرنے کا سبق دیا ہے۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ آپ کی شہرت نے آپ کے قدموں میں دولت کے ڈھیر لگا دیئے ہیں! ہم ضرورت مند ہیں، آپ ہماری امداد کیجئے، ہمیں کچھ عطا فرمایئے! راہب بولا:''

''میرے دوستو! میرے پاس اس بستر چٹائی اور لوٹے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اگر آپ کے یہ کسی کام آسکیں۔ تو انہیں لے جایئے، اس کے علاوہ میرے پاس نہ چاندی ہے۔ نہ سونا!''

اس پر وہ ناراض ہو کر چل دیئے۔ مگر تیسرا جاتے جاتے دروازے میں رک گیا اور کہنے لگا۔

''تم دھوکے باز ہو، تم فریبی ہو۔ تم مکار ہو، تم دوسروں کو ایسی نیکی کی تلقین کیوں کرتے ہو، جس پر خود عمل نہیں کر سکتے!''

☆☆☆☆☆

چودھویں کا چاند

چودھویں کا چاند اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ نمودار ہوا۔ شہر کے تمام کتوں نے چاند پر بھونکنا شروع کر دیا۔

صرف ایک کتا خاموش رہا۔ اس نے بڑی سنجیدگی سے دوسروں سے کہا

’’سکوت کو اس نیند سے نہ جگاؤ اور چاند کو اپنی للکار سے زمین پر نہ بلاؤ‘‘

دوسرے کتوں نے بھونکنا بند کر دیا۔ ہولناک خاموشی چھا گئی۔ لیکن وہ کتا جس نے دوسروں کو چپ رہنے کو کہا تھا۔ ساری رات خاموشی کی تلقین میں بھونکتا رہا!

☆☆☆☆☆

نو بار مرنا پڑے گا

ایک شاعر ایک شام ایک دیہاتی سے ملا، شاعر اجنبی تھا اور دیہاتی شرمیلا پھر بھی وہ دیر تک کھڑے آپس میں باتیں کرتے رہے! دیہاتی بولا۔

‘‘میں آپ کو ایک کہانی سناتا ہوں، جسے میں نے حال ہی میں سنا ہے۔ ایک چوہا پنجرے میں پھنس گیا اور پنجرے میں قید ہو کر بھی وہ مزے سے اندر پڑا پنیر کھا رہا تھا۔ باہر ایک بلی آن کھڑی ہوئی، چوہا پہلے تو ڈرا۔ لیکن پھر اسے خیال آیا کہ وہ تو پنجرے میں قید ہے اور بلی کے پنجوں سے محفوظ! یہ دیکھ کر بلی بولی۔’’

‘‘میرے دوست، جانتے بھی ہو کہ تم اپنا آخری کھانا کھا رہے ہو!’’

‘‘ہاں’’ چوہے نے جواب دیا ‘‘میرا جیون ایک ہے۔ اس لئے موت بھی ایک ہی ہوگی! لیکن تمہارا کیا خیال ہے خالہ؟’’

سنتے ہیں، نو جیون ہیں تمہارے، اس خیال کا مطلب یہ ہوا کہ تمہیں نو بار مرنا پڑے گا۔

دیہاتی نے شاعر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

‘‘کس قدر دلچسپ ہے یہ کہانی نہیں ہے کیا؟’’ شاعر نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ اور اپنے دل میں یہ کہتا ہوا چل دیا۔

بے شک ہمارے بھی نو ہی جیون ہیں۔ یقیناً نو! اور نو بار ہی ہم کو مرنا پڑے گا۔

نو بار! اچھا تھا کہ ہمارا بھی ایک ہی جیون ہوتا، پنجرے میں بند دیہاتی کا سا جیون، آخری کھانے کے لئے، پنیر کے ایک قتلے کے ساتھ۔ مگر کیا ہم جنگل وصحرا کے بادشاہ شیر کے قریبی نہیں؟

☆☆☆☆☆

نیکی اور بدی کے فرشتے

شہر کے دروازے پر ایک شام دو فرشتے ملے رسمی سلام دعا کے بعد ایک نے دوسرے سے پوچھا۔

کہو بھئی کیسے گزر رہی ہے کس کام پر ہو آج کل؟

''کیا کہوں تم سے'' دوسرا بولا میرے سپرد دور نیچے وادی میں بسنے والے ایک ایسے شخص کی نگہداشت کی گئی ہے۔ جو انتہائی گنہگار ہے۔ اور پست اخلاق اور یہ کام ایسا کٹھن ہے کہ تم شاید ہی اندازہ کر سکو۔ بس یہی سمجھو کہ دن رات جان مار رہا ہوں۔

''یہ تو سہل سی بات ہے'' پہلے نے کہا۔ کہ مجھے اکثر گنہگاروں سے سابقہ پڑا ہے۔ کئی بار بڑے بڑے پاپیوں کی نگہداشت پر رہا ہوں۔ مشکل تو اب آن پڑی ہے کہ مجھے اس درویش پر مقرر کر دیا گیا ہے۔ جو اس ''برگ پوش'' میں رہتا ہے اور تم نہیں جان سکتے، کہ یہ کام کس قدر دشوار ہے۔ اور نازک! ''یہ تو تمہارا خیال ہی ہے'' دوسرا بولا۔

''بھلا ایک درویش کی نگہداشت کسی گنہگار کی نگہداشت سے کیونکہ مشکل ہو سکتی ہے؟''

''عجب بدتمیزی ہے'' پہلے نے کہا۔

''میں تم سے ایک حقیقت بیان کر رہا ہوں اور تم اسے صرف خیال بتاتے ہو!''

بات تو تو، میں میں سے بڑھ کر ہاتھا پائی پر پہنچی اور پھر لگے دونوں طرف سے مکے اور پر برسنے!

ادھر یہ دونوں گتھی ہوئے کہ ایک شوخ وشنگ فرشتہ فرشتوں کا سردار کہیں سے ادھر آنکلا۔ اس نے دونوں کو علیحدہ کراتے ہوئے کہا۔

''بڑی شرم کی بات ہے کہ شہر کے دروازے پر دو مربی فرشتے یوں آپس میں

لڑیں۔ اور پھر بے وجہ مگر میں بھی تو سنوں کہ آخر قصہ کیا ہے؟“

دونوں ایک ساتھ چلا اٹھے۔ وہ چلا چلا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ جو کام ایک کے ذمے ہے، وہ دوسرے کے کام سے کہیں زیادہ کٹھن ہے۔ اور اس لئے وہ دوسرے سے افضل ہے!

یہ سن کر بڑا فرشتہ سوچ میں پڑ گیا!

”میرے رفیقو میں یہ فیصلہ تو نہیں دے سکتا“ وہ بولا کہ تم میں سے ستائش کا زیادہ حقدار کون ہے لیکن امن قائم رکھنے کے لئے میں تمہارے منصب ضرور بدلے دیتا ہوں۔ اس لئے کہ تم دوسرے کے کام کو آسان سمجھتے ہو! اچھا اب خوش خوش اپنے اپنے نئے کام پر چلے جاؤ۔

دونوں فرشتے نئے احکام سن کر اپنے اپنے راستے پر چل تو دیئے مگر مڑ مڑ کر اس سردار فرشتے کو گھور رہے تھے۔ اور دل ہی دل میں کہہ رہے تھے۔

”بڑے آئے سردار بن کر زندگی کا ہر روز پہلے سے بھی زیادہ دوبھر بنائے جا رہے ہیں!“

لیکن وہ سردار فرشتہ وہیں کا وہیں کھڑا تھا۔ اور سوچ رہا تھا۔ اب ہمیں اور بھی زیادہ محتاط رہنا پڑے گا ان نگہبان فرشتوں کی نگہداشت کے لئے!

☆☆☆☆☆

قدر جوہر

دور پہاڑ کے دامن میں ایک آدمی رہتا تھا۔ اس کے پاس پرانے استادوں کا بنایا ہوا ایک مجسمہ تھا۔ جو اس کے دروازے پر اوندھا پڑا رہتا تھا اور اسے اس کی کچھ قدر معلوم نہ تھی!

ایک دن ایک شہری ادھر سے گزرا، ایک پڑھا لکھا عالم، اس نے اس بت کو دیکھ کر اس کے مالک سے پوچھا۔

"کیا آپ اسے بیچیں گے؟"

یہ سن کر وہ ہنس دیا۔

"اس پتھر کو کون کیوں خریدے گا؟"

شہری بولا

"ایک درہم تو میں پیش کرتا ہوں"

دیہاتی اس سودے پر حیران تھا مگر اسے کیا، وہ اپنا درہم گرم ین باندھ چکا تھا!

شہری بت کو ہاتھی کی پیٹھ پر لاد کر شہر اٹھا لے گیا۔

کئی مہینوں کے بعد وہ دیہاتی شہر گیا۔ تو بازار میں ہرتے پھراتے ایک جگہ بھیڑ لگی دیکھ کر وہ بھی رک گیا اور ایک آدمی اونچی آواز میں پکار رہا تھا۔

"آؤ ایک نادر شاہکار دیکھو، ایک انمول مجسمہ جس کی نظیر دنیا بھر میں کہیں نہ مل سکے گی صناعی کے اس بے مثل نمونے کی "زیارت" کے لئے صرف دو درہم صرف دو درہم!" دیہاتی بھی دو درہم دے کر وہ نادر روزگار مجسمہ دیکھنے کے لئے داخل ہو گیا۔ جسے اس نے خود ایک درہم کے بدل بیچا تھا!

☆☆☆☆☆

Iqbal Cyber Library

اطمینان و بے اطمینانی

ایک غریب شاعر ایک دفعہ کسی چوراہے پر ایک دولتمند بیوقوف سے ملا

وہ دیر تک کھڑے ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے اور ان کی اس بات چیت کے ترجیحی نغمے، کی ہر تان اطمینان کے فقدان پر ٹوٹتی!

قضا و قدر کا فرشتہ ادھر سے گزر رہا تھا۔ اس نے دونوں کو اپنے پروں کے سائے تلے لیا یہ کرشمہ ہی تو تھا، کہ دونوں کی املاک کا باہم تبادلہ ہوگیا۔ انہیں اس کا پتہ تک بھی نہ چلا، اور پھر وہ ایک دوسرے سے جدا ہوگئے! لیکن حیرت ہی کی بات ہے نا کہ پھر بھی شاعر یہ سمجھ رہا تھا۔ کہ اب اس کے پلے کچھ نہیں رہا سوائے خشک ریت کے اور بےوقوف آنکھیں بند کرنے پر صرف یہ محسوس کرتا تھا کہ اس کے دل پر بادل تیر رہے ہیں۔

☆☆☆☆☆

رقص کائنات

ایک رقاصہ سامان طرب کے مکمل التزام کے ساتھ پرکشا کے شہزادے کے حضور میں حاضر ہوئی۔ بازیابی پر اس نے اپنا رقص اس انداز سے پیش کیا کہ اس کے بدن کی ہر جنبش، شہنائی، بربط اور چھتارا ہر ساز کے ساتھ ہم آہنگ تھی!

اس نے شعلوں کا ناچ پیش کیا۔ تلواروں اور بلموں کا رقص دکھایا اور پھر وہ زمان و مکان اور ستاروں کی گردش بن کر تھرکنے لگی اور آخر میں اس نے پھولوں کا رقص پیش کیا، پھول جنہیں آندھی اپنی لپیٹ میں لئے اڑ رہی ہو!

رقص کے بعد وہ شہزادے کے تخت کے سامنے کھڑی ہو گئی سرنگوں اور دست بستہ۔

شہزادے نے رقاصہ کو اپنے قرب کا فخر بخش کر اس کو مخاطب کیا۔

"اے خوب صورت عورت، اے زائدہ مسرت و رعنائی تو نے یہ جادو کہاں سے سیکھا ہے۔ تو نے اپنے ترنم اور تناظم سے تو عناصر کو بھی مسخر کر لیا ہے!"

رقاصہ دو زانو ہو کر بولی۔

"اے جلیل القدر شہزادے، مجھے یہ تاب کہاں کہ میں تیرے سوالوں کا جواب دے سکوں لیکن میں اتنا ضرور جانتی ہوں کہ اگر فلسفی کی روح اس کے دماغ میں شاعر کی اس کے دل میں ہوتی ہے اور مغنی کی اس کے گلے میں، تو رقاص کی روح اس کے روئیں روئیں میں پھڑکتی ہے۔"

☆☆☆☆☆

شکار اور شکاری

تین کتے دھوپ میں بیٹھے گپ لڑا رہے تھے۔

ایک کتے نے اونگھتے ہوئے دوسرے سے کہا۔

”آج کتوں کی دنیا میں رہنا بھی کیا غضب ہے۔“

دیکھو تو ہم کس بے تکلفی ہے، ہوا میں، پانی میں اور زمین پر چل سکتے ہیں اور ذرا ان ایجادوں پر بھی تو غور کرو، جو صرف ہماری آسائش کے لئے اختراع ہوئی ہے۔

ہماری ناک، کان ار آنکھ کے لئے! دوسرا کتا بولا۔

”میرے خیال میں، ہم میں جمالیاتی حس بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ ہم چاند پر اپنے اجداد سے کہیں بہتر انداز میں بھونکتے ہیں اور جب اپنے نقوش کا عکس پانی میں دیکھتے ہیں تو انہیں کل سے بہتر پاتے ہیں!“

تیسرے نے کہا۔

”لیکن بھائی جو اطمینان اور مسرت مجھے کتوں کی باہمی مفاہمت سے ہوتی ہے۔ وہ کسی اور شے سے نہیں ملتی وہ کہہ رہا تھا کہ ان سب نے کتوں کے شکاری کو آتے دیکھا، بس پھر تو بھاگنے لگے سب دم دبا کر۔“

تینوں کتے بے تحاشا بھاگ رہے تھے اور ایک چلا چلا کر کہہ رہا تھا ارے بھائی! خدا کے لئے نکل جاؤ جانیں بچا کر کہ تہذیب حاضر وہ ہمارے تعاقب میں ہے!

☆☆☆☆☆

سعادت کا گھر

میرا دل میرے سینہ میں اکتا گیا اور مجھے چھوڑ کر سعادت کے گھر کی طرف چلا گیا۔ اس حرم میں پہنچ کر جسے نفس نے مقدس کیا ہے، وہ حیران و پریشان کھڑا ہو گیا، اس لئے کہ وہاں اس نے وہ چیزیں نہیں دیکھیں جن کا تصور وہ اب تک کرتا رہا تھا۔ اسے وہاں قوت، مال، اقتدار، کچھ نظر نہ آیا۔ وہاں اس نے حسن کے نوجوان پیکر، اس کی بیوی، محبت کی بیٹی اور ان کی بچی حکمت کے سوا کسی کو نہ پایا۔

میرے دل نے محبت کی بیٹی سے پوچھا:

"محبت! قناعت کہاں ہے، میں نے تو یہ سنا تھا کہ وہ تمہارے ساتھ اس گھر میں رہتی ہے؟"

اس نے جواب دیا:

"قناعت پند و نصیحت کے لئے شہر میں گئی ہے، جہاں حرص و طمع کا دور دورہ ہے۔ ہم اس کے محتاج نہیں! سعادت کو قناعت کی بالکل خواہش نہیں، اس لئے کہ سعادت وہ شوق ہے جس سے وصال ہم آغوش ہے، اور قناعت وہ بلاوا، اس لئے کہ وہ کمال کو چاہتی ہے اور کمال ایک سلسلہ لاانتہائی اور غیر مختتم سلسلہ!"

اب میرے دل نے حسن کے جوان پیکر سے سوال کیا:

"جمال! مجھے عورت کا راز سمجھا کہ تو ہی معرفت ہے!"

اس نے جواب دیا!

"عورت جو ہے! اے قلب انسانی جو تیری کیفیت ہے وہی اس کی بھی کیفیت ہے!! عورت میں ہوں! جہاں کہیں میں ہوتا ہوں وہ بھی وہیں ہوتی ہے۔ عورت مذہب ہے، اگر جاہلوں نے اس میں کوئی تحریف نہ کی ہو، وہ ماہ کامل ہے، اگر بادلوں نے اسے روپوش نہ کر دیا ہو، وہ نسیم ہے، اگر اس کا دامن شر و فساد کے دھبوں میں سے پاک و صاف ہو۔ اب میرا دل حسن و محبت کی بیٹی حکمت کے پاس گیا اور

اس سے کہا:''

''مجھے حکمت عطا کر! کہ میں انسان کے پاس لے جاؤں۔''

اس نے جواب دیا!

''انسان سے کہہ دے! کہ حکمت وہ سعادت ہے، جو اس کے نفس کی انتہائی پاکیزگیوں میں جنم لیتی ہے، نہ وہ کہ جو خارج سے آتی ہے!''

☆☆☆☆☆

پھول کا گیت

میں وہ کلمہ ہوں، جسے فطرت نے اپنی زباں سے ادا کیا، پھر واپس لے کر اپنے دل کی تہوں میں چھپا لیا اور اس کے بعد دوبارہ ادا کیا۔

میں وہ ستارہ ہوں، جو نیلگوں خیمہ سے سبز بساط پر اترا۔

میں عناصر کا نور چشم ہوں، جس کا نطفہ رحم سرما میں قرار پایا، جو بطن بہار سے پیدا ہوا، جسے آغوش گرما نے پروان چڑھایا اور دست خزاں نے سلا دیا۔

میں عاشقوں کا تحفہ ہوں۔

میں شادی کا تاج ہوں۔

میں زندہ کی طرف سے مردے کی خدمت میں آخری پیشکش ہوں۔

میں صبح سویرے، نور کی آمد آمد کے اعلان میں نسیم کا معاون ہوں اور شام کو اسے رخصت کرنے میں پرندوں کا شریک۔

میں میدانوں میں لہلہا کر انہیں زینت بخشتا ہوں اور ہوا میں سانس لے کر اسے مہکاتا ہوں۔

میں نیند سے چمٹا ہوں اور رات کی بے شمار آنکھیں مجھ پر گڑ جاتی ہیں اور بیداری کی طلب کرتا ہوں تاکہ دن کی ایک آنکھ میں اپنی آنکھیں ڈال دوں۔

میں شبنم کی شراب پیتا ہوں۔ کوئل کے نغمے سنتا ہوں اور گھاس کی تالیوں پر ناچتا ہوں۔

میں مشاہدہ نور کے لئے ہمیشہ بلندی کی طرف دیکھتا ہوں، اپنے سائے پر کبھی نظر نہیں ڈالتا اور یہ وہ حکمت ہے، جسے انسان نے اب تک نہیں سیکھا!

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

بے زبان جانور

ایک دن، شام کو، جبکہ میرے تصورات میری عقل پر غالب آ گئے تھے، میں گھر سے نکلا اور شہر کے محلوں میں سے ہو کر گزرنے لگا۔ ایک خالی مکان کے سامنے پہنچ کر میں رک گیا، جس کی دیواریں گر چکی تھیں اور ستون زمین پر آ رہے تھے۔ مکان کی حالت سے صاف ظاہر تھا کہ وہ مدتوں سے غیر آباد ہے اور اس پر کوئی نہ کوئی غم انگیز تباہی نازل ہوئی ہے۔ میں نے دیکھا کہ ایک کتا راکھ پر پڑا ہے کمزور جسم زخموں سے چور چور ہے اور بیماریوں نے اسے ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا دیا ہے۔ اس کی نگاہیں، مغرب میں غروب ہوتے ہوئے سورج پر جمی ہیں۔ اس کی آنکھوں کو ذلت کی پرچھائیوں نے تاریک کر دیا ہے اور یاس و ناامیدی ان سے ٹپکی پڑتی ہے۔ گویا جانتا ہے کہ سورج نے اس ویران مقام سے جو کمزور جانوروں کو ستانے والے لڑکوں کی دسترس سے دور ہے، اپنے انفاس کی حرارت واپس لینی شروع کر دی ہے اور اسی لئے وہ اسے افسوس ناک الوداعی نگاہوں سے تک رہا ہے۔ میں آہستہ آہستہ اس کی طرف چلا، اپنے دل میں خواہش لئے ہوئے کہ اگر میں اس کی زبان میں گفتگو کر سکتا تو ان تکلیفوں پر اسے دلاسا دیتا اور اس مصیبت پر اس سے ہمدردی ظاہر کرتا۔ جب میں اس کے قریب پہنچا، تو اس نے مجھ سے خوف زدہ ہو کر اپنی قریب الختم زندگی کی باقی ماندہ قوتوں کو جمع کیا اور کوشش کی کہ اپنی ان ٹانگوں کے سہارے وہاں سے چلا جائے، جنہیں بیماری نے مفلوج کر دیا تھا اور موت جن کی حفاظت کر رہی تھی۔ لیکن وہ اپنی جگہ سے اٹھ ہی نہ سکا اور مجھے تکنے لگا، ایسی نگاہ سے، جس میں استرحام کی تلخی اور کرم طلبی کی شیرینی تھی ایک ایسی نگاہ سے، جو نطق کی قائم مقام تھی، اس لئے انسان کی زبان سے زیادہ فصیح اور عورت کے آنسوؤں سے زیادہ بلیغ تھی۔

جب میری نگاہیں اس کی غمگین نگاہوں سے ملیں تو میرے جذبات میں حرکت پیدا ہوئی اور احساسات بیدار ہو گئے۔ میں نے ان نگاہوں کو مجسم کیا اور انسانی کلام

کا جامہ پہنا دیا۔ وہ نگاہیں کہہ رہی تھیں:

"مجھ پر جو کچھ بیت رہی ہے، وہی میرے لئے کافی ہے! میں نے انسان کے جتنے مظالم برداشت کیے ہیں اور بیماریوں کی جتنی تکلیفیں جھیلی ہیں، وہی میرے لئے بہت ہیں! جاؤ! مجھ پر اور میرے سکون پر رحم کرو! مجھے سورج کی حرارت سے زندگی کے کچھ لمحے حاصل کرنے دو! میں ابن آدم کے ظلم اور سنگدلی سے بھاگ کر اس راکھ کے ڈھیر پر آ پڑا ہوں، جو اس کے دل سے نرم ہے، اس ویرانے میں آ چھپا ہوں، جو وحشت ناکی میں اس سے کہیں کم ہے۔ میرے پاس سے چلے جاؤ! کہ تم بھی زمین کے انہیں رہنے بسنے والوں میں سے ہو، جن کے فیصلے ادھورے اور انصاف سے عاری ہوتے ہیں۔"

میں ایک حقیر جانور ہوں، لیکن میں انسان کی خدمت کی ہے، اس کے گھر میں ایک مخلص و وفادار کی طرح رہا ہوں، اس کی رفاقت میں، میں نے حفاظت اور جاسوسی کے فرائض انجام دیئے ہیں۔ میں اس کے غم اور خوشی میں برابر کا شریک رہا، اس کی غیر موجودگی میں اسے یاد کرتا اور اس کی آمد پر خوشی سے پھولا نہ ساتا۔ میں نے اس کے دستر خوان کے ٹکڑوں پر قناعت کی اور اس کی چھوڑی ہوئی ہڈیوں کو اپنے لئے نعمت سمجھا لیکن جب میں بوڑھا ہو گیا، بیماریوں نے میرے جسم میں اپنے پنجے گاڑ دیئے تو اس نے مجھے نکال باہر کیا اور گلی کوچوں کے بے رحم لڑکوں کا کھلونا، اور بیماریوں کے تیروں کا نشانہ اور ہر قسم کی غلاظت کا مرکز بنا دیا۔

اے آدم کے بیٹے! میں ایک کمزور جانور ہوں، لیکن مجھ میں تیرے ان بہت سے کمزور بھائیوں میں ایک نسبت ہے جس کی قوتیں جواب دے جاتی ہیں تو روٹی کے ایک ایک ٹکڑے کو محتاج ہو جاتے ہیں اور تباہ حالی کے گڑھے میں گر پڑتے ہیں۔

میں ان سپاہیوں کی مثال ہوں، جو اپنی جوانی میں اپنے وطن کی طرف سے لڑے ہیں اور ادھیڑ عمر میں کھیتی باڑی کرتے ہیں، لیکن جب زندگی کا سرمائی موسم شروع ہو

جاتا ہے اور ان کے ہاتھ پاؤں بیکار ہو جاتے ہیں تو انہیں دھکے دیئے جاتے ہیں، انہیں بھلا دیا جاتا ہے!

میں اس عورت کی طرح ہوں، جو اپنی جوانی کو جوان دل کی تفریح کے لئے بناتی سنوارتی ہے، بیوی بن کر، بچوں کو پالنے کے لئے رات رات بھر جاگتی ہے۔ پختہ عمر کی عورت ہو کر، مردان مستقبل تیار کرنے کے لئے مصیبتیں اور تکلیفیں اٹھاتی ہے۔ لیکن جب بوڑھی ہو جاتی ہے تو مکروہ چیز سمجھ کر بالکل فراموش کر دی جاتی ہے آہ! اے انسان! تو کتنا ظالم ہے اور کس قدر سنگدل!

اس جانور کتے کی نگاہیں کلام کر رہی تھیں اور میرا دل سمجھ رہا تھا۔ میرے ذہن کا یہ عالم تھا کہ کبھی تو اس بے زبان جانور پر ترس کھاتا تھا اور کبھی اپنے ابنائے جنس کے ہولناک تصور سے لرز اٹھتا تھا۔

جب اس کتے نے اپنی آنکھیں بند کر لیں تو میں نے اسے پریشان کرنا مناسب نہ سمجھا اور وہاں سے چلا آیا۔

☆☆☆☆☆

شاعر کی زندگی

رات نے ڈیرے ڈال دیئے تھے اور برف باری نے سارے شہر کو سفید لباس پہنا دیا تھا۔ سردی اس بلا کی تھی کہ اہل شہر بازاروں سے بھاگ کر اپنے اپنے مکانوں میں جا چھپے تھے، ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی، جیسے کوئی غم زدہ، سنگین قبروں کے درمیان، اپنے عزیز کی موت پر جسے پنجہ شیر نے زندگی کی لذتوں سے محروم کر دیا ہو سسکیاں بھرے!

شہر کے کنارے، ایک چھوٹا سا مکان تھا، جس کے ستون خمیدہ اور چھت برف کی شدت سے اس قدر جھک گئی تھی، گویا گرا ہی چاہتی ہے۔ اس مکان کے ایک گوشتہ میں، پھٹے پرانے بستر پر، ایک قریب المرگ آدمی پڑا تھا، اس کی نگاہیں ایک ٹمٹماتے چراغ پر تھیں، جو ہر ساعت تاریکی پر غالب آنا چاہتا تھا اور ہر لمحہ مغلوب ہو جاتا تھا۔

ایک نوجوان جسے معلوم تھا کہ اب زندگی کے جھگڑوں سے چھٹکارا پانے کا وقت قریب آگیا ہے۔ اس کے زرد چہرہ پر امید کی روشنی تھی اور خشک ہونٹوں پر مایوس تبسم!

ایک شریف انسان جو زندگی کو شادکام بنانے کے لئے یزدانی برکتوں کا مژدہ لے کر اترا تھا اس سے پہلے کہ انسانیت اس پر مسکرائے، دنیا سے رخصت ہو رہا تھا۔

اس کے آخری سانس نزع کی کشمکش میں مبتلا تھے اور کوئی اس کے پاس نہ تھا، سوائے اس ٹمٹماتے چراغ کے، جو اس کا مونس تنہائی تھا، اور ان اوراق پریشاں کے، جن پر اس کے لطیف روحانی خیالات موتسم تھے۔

اس جاں بلب جواں مرگ نے اپنی باقی تمام قوتوں کو، جو آغوش میں آسودہ ہونے ہی والی تھیں، جمع کیا، اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے اور نیم مردہ پلکوں کو اس طرح جنبش دی، گویا تماشائے انجم کے لئے اپنی آخری نگاہوں سے جھونپڑے کی چھت کو پھاڑ دینا چاہتا ہے۔

وہ کہنے لگا:

”آ، اے حسین موت آ! میری روح تیری مشتاق ہے میرے قریب آ، اور مادی زنجیریں توڑ دے۔ میں اس لامتناہی سلسلہ سے اکتا گیا ہوں۔

آ، اے شیریں موت! اور مجھے ان لوگوں میں سے نکال، جو مجھے اجنبی سمجھتے ہیں، صرف اس بنا پر کہ میں جو کچھ فرشتوں سے سنتا ہوں، انسانی زبان میں ادا کر دیتا ہوں۔“

آ، جلدی سے میرے قریب آ، کیونکہ دنیا میرے خیال سے فارغ ہے، اس نے مجھے گوشہ نسیاں میں ڈال دیا ہے، صرف اس بات پر کہ میں اس کی طرح مال و دولت کی پوجا نہیں کرتا اور نہ اپنے سے کمزور کو اپنا غلام بنانا چاہتا ہوں۔

آ، اے میری من موہنی! آ، اور مجھے اپنے ساتھ لے چل، کیونکہ میرے پس ماندوں کو اب میری ضرورت نہیں رہی۔ آ، اور مجھے اپنے محبت بھرے سینہ سے چمٹا لے، میرے ان ہونٹوں کو بوسہ دے جو کبھی اپنی ماں کے پیار سے لذت آشنا نہیں ہوئے جنہوں نے کبھی اپنی بہن کے رخساروں کو مس نہیں کیا اور جنہوں نے آج تک اپنے محبوب کے چہرہ کا بوسہ نہیں لیا۔ آ، میری پیاری موت! جلدی آ، اور مجھے آزاد کر!

اس وقت مرنے والے کے بستر کی جانب نسوانی سایہ تھا، غیر مادی اور متحرک سایہ! جس کے جسم پر سفید برف سا لباس تھا اور ہاتھوں میں فردوسی پھولوں کا تاج۔

سایہ رینگا اور اس کے گلے لگ گیا اس نے شاعر کی آنکھوں کو بند کر دیا، تاکہ وہ روح کی آنکھوں سے مشاہدہ کرے اور اس کے لبوں کو محبت کا بوسہ دیا وہ بوسہ محبت جس نے اس کے ہونٹوں پر ابدی تبسم چھوڑ دیا۔

اب اس گھر میں، مٹی کے ایک ڈھیر اور ان اوراق کے سوا، جو اندھیرے میں ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے، اور کچھ نہ تھا۔

صدیاں بیت گئیں اور اس شہر کے رہنے والے، بے حسی، لاپروائی اور سکھ چین کی

نیند سوتے رہے۔ بالآخر جب وہ بیدار ہوئے اور ان کی آنکھیں صبح معرفت کے نور سے روشن ہوئیں تو انہوں نے ”میدان عام“ میں اس شاعر کا بت نصب کیا اور ہر سال اس کی برسی منانے لگے۔

آہ! انسان کی نادانی!

☆☆☆☆☆

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved
2002-2006

بیوہ کی دعا

دن پر غالب آنے کے لیے، جس میں وادی قادیشا کے آس پاس کے گاؤں میں مسلسل برف باری ہوتی رہی تھی، رات نے نہایت تیزی سے حملہ کر دیا اور کھیتوں اور پہاڑیوں کو ایک سفید و سادہ صفحہ بنا دیا، جس پر ہوا پہلے کچھ لکھتی اور پھر مٹا دیتی تھی، جس سے آندھیوں کے جھکڑ، غضب ناک فضا کو وحشت انگیز فطرت سے آمیز کرتے ہوئے کھیل رہے تھے۔

انسان مکانوں میں جا چھپے تھے اور مویشی باڑوں میں، ہر ذی حیات حرکت و عمل سے عاجز تھا اور خلش آفریں سردی، بے پناہ خیلی، خوفناک و سیاہ رات اور ہولناک و طاقت ور موت کے کچھ باقی نہ رہا تھا۔

گاؤں کی آبادی سے الگ، ایک تنہا مکان میں، ایک عورت، انگیٹھی کے سامنے بیٹھی، اونی چادر بن رہی تھی، پہلو میں اس کا اکلوتا بچہ تھا، جو کبھی آگ کے شعلوں کو دیکھتا تھا اور کبھی اپنی ماں کے پرسکون چہرہ کو۔ یکایک آندھی تیز ہوگئی اور مکان کے در و دیوار لرزنے لگے۔ بچہ ڈر کر ماں سے اور قریب ہو گیا، تا کہ اس کی آغوش شفقت میں عناصر کی غضب ناکی سے محفوظ ہو جائے ماں نے اسے اپنے سینہ سے چمٹا کا پیار کیا اور اپنے گھٹنوں پر بٹھا کر کہنے لگی:

"بیٹا! ڈرو نہیں، فطرت انسان کو اس کی بے بضاعتی کے مقابلہ میں اپنی عظمت اور اس کی کمزوری کے مقابلہ میں اپنی طاقت کا مظاہرہ کر کے نصیحت کرنا چاہتی ہے۔ نہ ڈر! میرے بچے! کہ زمین پر گرتی ہوئی برف، آسمان پر چھائے ہوئے بادلوں اور فضا کو تلپٹ کر دینے والی آندھی کے جھکڑوں کے پس پردہ ایک حام اور برگزیدہ روح ہے، جو میدانوں اور پہاڑوں کی ضروریات کو جانتی ہے، ہر چیز کے پس پردہ ایک روزن ہے، جس میں سے یہ روح انسان کے بے بضاعتی کو بہ نگاہ رحمت و شفقت دیکھتی ہے۔ خوف نہ کھا! میرے کلیجہ کے ٹکڑے! کہ فطرت، جو پہاڑ میں مسکراتی،

گرمیوں میں قہقہے لگاتی اور خزاں میں آہیں بھرتی ہے، اب رونا چاہتی ہے تاکہ زمین کے انتہائی طبقہ میں پڑی ہوئی زندگی اس کے سرد آنسوؤں سے اپنی پیاس بجھالے۔ میرے بچے! سو جا! کل جب تو بیدار ہوگا تو آسمان کو صاف اور میدانوں کو برف کی سفید چادر اوڑھے دیکھے گا جس طرح موت سے مقابلہ کے بعد روح پاکیزگی کا لباس پہن لیتی ہے سو جا! میرے اکلوتے بچے! تیرا باپ اس وقت ہمیں ابدیت کی نزہت گاہوں سے دیکھ رہا ہے۔ مبارک ہے وہ آندھی اور وہ برفباری، جو ہمیں ان غیر فانی روحوں کی یاد سے ہم آغوش کردے! میرے پیارے! سو جا! بہار آنے پر تو انہیں عناصر سے، جو آج نہایت شدت سے۔ آپس میں دست و گریباں ہیں، خوبصورت پھول توڑے گا جس طرح انسان الم ناک دوری حوصلہ فرسا صبر اور ہلاکت خیز مایوسی کے بعد محبت کا پھل پاتا ہے میری آنکھوں کے نور! سو جا! سو جا! کہ شیریں خواب رات کی ہیبت اور سردی کی شدت سے بے خوف ہوکر، تجھ تک آئیں گے۔”

بچے نے اپنی ماں کی طرف دیکھا، نیند نے اس کی آنکھوں کی سرمگیں بنا دیا تھا۔ وہ کہنے لگا!

”اماں! نیند نے میری پلکوں کو بوجھل بنا دیا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہیں میں صبح کی نماز پڑھنے سے پہلے ہی نہ سو جاؤں۔“

مہربان ماں نے اسے اپنے گلے سے لگالیا اور اشک آلود آنکھوں سے اس کے چہرہ کو دیکھنے لگی، جس پر فرشتوں کی معصومیت کھیل رہی تھی، اس نے کہا:

”میرے بچے! میرے ساتھ دعا مانگ: یارب! فقیروں پر رحم کر! انہیں بے پناہ سردی کی سنگدلی سے بچا! اور ان کے عریاں جسموں کو اپنے ہاتھوں سے ڈھانپ!“

جھونپڑیوں میں سوئے ہوئے یتیموں اور برف کی تیر افگنی کو دیکھ! جو ان کے جسموں کو چھیدے ڈالتی ہے!

یارب! بیواؤں کی فریاد سن! جو سڑکوں پر موت کے چنگل اور سردی کے پنجوں میں گھری کھڑی ہیں۔

یارب! اپنا ہاتھ سرمایہ دار کے دل کی طرف بڑھا، اور ان کی چشم بصیرت کو وا کر! تا کہ وہ کمزوروں اور مظلوموں کی تباہ حالی دیکھ سکیں!

یارب! ان بھوکوں پر مہربانی فرما! جو اس تیرہ و تار رات میں دروازے کے سامنے کھڑے ہیں اور پردیسیوں کی غریب الوطنی پر رحم کھا کر گرم مسکنوں کی طرف ان کی رہنمائی کر!

یارب! چھوٹی چھوٹی چڑیوں کی طرف دیکھ! اور اپنے دائیں ہاتھ سے ان درختوں کی حفاظت کر! جو ہوا کی تندھی سے خائف ہیں۔

یارب! ایسا کر، کہ تجھ میں سب قدرت ہے!

جب نیند بچہ سے ہم آغوش ہوگئی تو ماں نے اسے، اس کے بستر پر لٹا دیا اور کانپتے ہونٹوں سے اس کی پیشانی کا بوسہ لیا۔ اور کے بعد اٹھی اور انگیٹھی کے سامنے بیٹھ کر، اس کے لئے اونی چادر بننے لگی۔

☆☆☆☆☆

---

1 وادی قادیسا، یعنی مقدس لوگوں کی وادی، اس نام سے اس لئے موسوم ہے کہ زاہدوں کا ملجا، اب بحرو پسندوں کا ماوی ہے جو دنیا کی بدبختیوں اور سماج کے ہنگاموں سے اکتا کر بھاگتے ہیں۔ یہاں انہیں ایک عام سناٹا اور وہ غار بہ آسانی سے مل جاتے ہیں، جنہیں دست فطرت زمین کا سینہ چیر کا بناتا ہے۔ یہ وادی اس قدر گہری ہے کہ اگر سورج کی شعاعیں چاہیں بھی تو بیک وقت اس کی پنہائیوں کا احاطہ نہیں کر سکتیں اسے لبنان کے سینہ کا گہرا زخم سمجھنا چاہیے وہ گہرا زخم جو نہایت گہری دوستی کے بعد، زمانہ کے ہاتھوں اسے پہنچا۔

محبت

نہر کے کنارے، اخروٹ اور بید مشک کے درختوں کی چھاؤں تلے ایک غریب کسان کا لڑکا بیٹھا، بہتے پانی کو نہایت سکون و خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ یہ نوجوان کھیتوں میں پروان چڑھا تھا، جہاں ہر چیز محبت کی کہانی سناتی ہے، جہاں شاخیں آپس میں گلے ملتی ہیں، جہاں نسیم بہار پھولوں سے آنکھ مچولی کھیلتی ہے، جہاں پرندے الفت کے گیت گاتے ہیں، اور جہاں فطرت اپنی تمام نظر فریبیوں کے ساتھ روحانیت کی تلقین کرتی ہے۔

اس بیس سالہ نوجوان نے کل ایک دوشیزہ کو چشمہ کے کنارے، حسین لڑکیوں کے جھرمٹ میں دیکھا اور عاشق ہوگیا، لیکن اب اسے یہ معلوم ہوا کہ وہ بادشاہ کی لڑکی ہے تو اس نے اپنے دل کو ملامت کی اور اپنی روح سے خود اس کی شکایت کی۔ مگر بے سود! ملامت دل کی محبت سے باز رکھ سکتی ہے، نہ شکایت روح کو حقیقت سے ہٹا سکتی ہے۔ انسان، اپنے دل اور روح کے درمیان، اس نرم نازک شاخ کی مثال ہے، جو شمالی اور جنوبی ہواؤں کی زد میں ہو!

نوجوان نے نگاہ اٹھائی: بنفشہ کے پھول، بابونہ کے پھولوں کے ہم پہلو اگے ہوئے تھے، اور بلبل قمری سے سرگوشیاں کر رہی تھی۔ اسے اپنی تنہائی پر رونا آ گیا، محبت کی گھڑیاں اس کی نگاہوں کے سامنے سے پرچھائیوں کی طرح گزر گئیں۔ اس نے کہا الفاظ اور آنسوؤں کے ساتھ اس کے جذبات بھی رواں تھے:

”یہ محبت ہی ہے، جو میرا مذاق اڑاتی ہے! دیکھو! وہ مجھے بے وقوف بنا کر اس جگہ لے آئی ہے، جہاں آرزوئیں عیب سمجھی جاتی ہیں اور تمنائیں ذلت!“

محبت نے جس کا میں پجاری ہوں میرے دل کو تو شاہی محل میں اچھال پھینکا اور میری زندگی کو ایک غریب کسان کی پست و زبوں جھونپڑی میں دھکیل دیا۔ آہ! اس نے میری روح کو اس پری وش کے حسن کا اسیر کر دیا، جسے لوگ ہر وقت گھیرے رہتے

ہیں اور اقتدارِ اعلیٰ جس کی حفاظت کرتا ہے!

اے محبت! میں تیرا حلقہ بگوش ہوں، پھر تو مجھ سے کیا چاہتی ہے؟ میں تیرے پیچھے پیچھے آتشیں راستوں پر چلا اور شعلوں نے مجھے لپک لیا، میں نے اپنی آنکھیں کھولیں، لیکن تاریکی کے سوا، مجھے کچھ نظر نہ آیا، میں نے اپنی زبان کو جنبش دی، لیکن یاس و ناامیدی کے سوا ایک لفظ میرے منہ سے نہ نکلا۔

اے محبت! ''شوق'' نے مجھے ایک ایسی ''روحانی تشنگی'' سے ہم کنار کر دیا ہے، جو محبوب کے بوسے کے سوا، رفع نہیں ہو سکتی۔

میں کمزور ہوں، اے محبت! اور تو قوی، پھر مجھ سے کیوں جھگڑتی ہے؟ میں بے گناہ ہوں اور تو عادل، پھر مجھے اپنے ظلم و ستم کا نشانہ کیوں بناتی ہے؟ مجھے کیوں ذلیل کرتی ہے؟ جبکہ تیرے سوا، میرا کوئی مددگار نہیں! مجھ سے بے تعلق کیوں ہوتی ہے؟ جبکہ تو ہی میری خلقت کا سبب ہے! اگر میرا خون تیری مرضی کے خلاف رگوں میں گردش کرے، تو اسے بہا دے! اگر میرے قدم، تیری راہ کے سوا، ذرا بھی حرکت کریں، تو انہیں کاٹ ڈال! اس جسم کے ساتھ جو تیرا جی چاہے، کر! لیکن میری روح کو ان پرسکون کھیتوں میں، اپنے بازوؤں کے زیرِ سایہ، لطف اٹھانے دے!

نہریں اپنے محبوب، سمندر کی طرف رواں ہوتی ہیں، پھول اپنے معشوق، نور کے لئے مسکراتے ہیں، بادل اپنی ارادت مند، وادی میں اترتے ہیں لیکن میں جس کی بپتا سے نہریں واقف ہیں، نہ پھول اور بادل خود کو اپنے غم میں تنہا اور اپنی محبت میں اکیلا پاتا ہوں ''اس'' سے دور، جو مجھے اپنے باپ کی فوج کا سپاہی بنانا پسند کرے گی نہ اپنے محل کا خادم!

نوجوان تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گیا، گویا نہر کی نغمہ آگیں روانی اور شاخوں کے پتوں کی لطیف سرسراہٹ سے گفتگو کا سلیقہ سیکھنا چاہتا ہے۔ اس نے دوبارہ کہنا شروع کیا:

''اے وہ، کہ میں تیرے نام سے اس قدر مرعوب وخائف ہوں کہ تجھے، تیرا نام لے کر پکار بھی نہیں سکتا! اے شان وشکوہ کے پردوں اور عظمت وجلال کی دیواروں میں مجھ سے چھپنے والی! اے وہ حور بقاء کی ابدیت کے سوا جہاں ہر طرف مساوات ہی مساوات ہے، میں تجھ سے ملنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا! اے وہ، کہ تلواریں تیری اطاعت کرتی ہیں، گردنیں تیرے سامنے خم ہوتی ہیں اور خزانوں اور عبادتگاہوں کے دروازے تیرے لئے کھلے ہیں! تو نے میرے دل پر قبضہ کر لیا، جسے محبت نے مقدس کیا تھا، میری روح کو اپنا غلام بنا لیا ہے، جسے اللہ نے شرف وامتیاز بخشا تھا اور میری عقل کو پرچا لیا ہے، جو کل ان کھیتوں کی آزاد فضا میں بے فکر تھی، لیکن آج محبت کی زنجیروں میں مقید ہے۔''

اے حسین دوشیزہ! جب میں نے تجھے دیکھا، تو اپنی تخلیق کی غایت کو پا لیا، لیکن جب میری نظر تیری بلدی اور اپنی پستی پر گئی، تو مجھے معلوم ہو گیا فطرت کے کچھ راز ہیں، جو انسان کی سمجھ میں نہیں آ سکتے، اور کچھ راستے ہیں، جو روح کو ایک ایسے مقام پر لے جاتے ہیں جہاں محبت انسانی قانون سے بالاتر ہو کر حکومت کرتی ہے۔

اے غزال رعنا! جب میں نے تیری مست انکھڑیاں دیکھیں، تو مجھے یقین ہو گیا کہ یہ زندگی ایک جنت ہے اور انسان کا دل، اس کا دروازہ! لیکن جب تیری عظمت اور ذلت کو مارو اور رٹبال کی طرح آپس میں گتھم گتھا ہوتے پایا، تو جان لیا کہ یہ زمین میرا وطن نہیں ہو سکتی۔

اے حسن وجوانی کے پیکر لطیف! جب میں نے تجھے حسین لڑکیوں کے جھرمٹ میں بیٹھے دیکھا جیسے پھولوں میں گلاب! تو گمان کیا کہ میرے خوابوں کی دلہن نے انسانی قالب، اختیار کر لیا ہے، لیکن جب مجھے تیرے باپ کی بزرگی اور مرتبہ کا علم ہوا تو میری سمجھ میں آ گیا کہ گلاب کا پھول توڑنے سے پہلے ان کانٹوں سے سابقہ پڑتا ہے، جو انگلیوں کو زخمی کر دیتے ہیں، ہاں میری سمجھ میں آ گیا کہ جو کچھ خواب جمع

کرتے ہیں، بیداری اسے منتشر کر دیتی ہے!

نوجوان اٹھا اور ان الفاظ میں یاس و ناامیدی کی تصویر کھینچا ہوا شکستہ دلی اور بے دلی کے ساتھ چشمہ کی طرف روانہ ہوا:

''اے موت! آ، اور مجھے زندگی کی قید سے چھڑا لے! وہ سر زمین، جہاں کانٹے پھولوں کا گلا گھونٹتے ہوں، رہنے کے قابل نہیں۔''

آ، اور مجھے اس زمانے سے نجات دے، جس میں محبت کو عظمت کی کرسی سے اتار کر، اس کی جگہ دنیوی عزت کو بٹھا دیا گیا ہے۔

مجھے آزاد کر، اے موت! وہ محبت بھرے دلوں کی ملاقات کے لئے آغوش ابد اس دنیا سے کہیں زیادہ موزوں ہے۔ وہاں میں اپنی محبوبہ کا انتظار کروں گا! اور وہیں ہم دونوں ملیں گے!

جب وہ چشمہ پر پہنچا تو شام ہو چلی تھی اور سورج نے اس کھیت سے اپنی سنہری چادر سمیٹنی شروع کر دی تھی۔ حسین شہزادی کے قدموں تلے روندی ہوئی زمین پر بیٹھ کر وہ رونے لگا۔ اس نے اپنا سر سینہ کی طرف جھکا لیا، گویا ''قلب گریزاں'' پر قابو پانا چاہتا ہے۔

اس اثناء میں، بید مشک کے درختوں میں سے ایک دوشیزہ سبزے کو اپنے دامنوں سے نہال کرتی نمودار ہوئی۔ وہ نوجوان کے پہلو آ کھڑی ہوئی اور اپنا نرم و نازک ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا، نوجوان نے گھبرا کر نگاہ اٹھائی اس سونے والے کی طرح، جسے سورج کی شعاعوں نے بیدار کر دیا ہو۔ اس نے دیکھا: شہزادی سامنے کھڑی ہے۔ وہ گھٹنوں کے بل کھڑا ہو گیا، جس طرح موسیٰ طور کی چوٹی پر اپنی محبت کا جلوہ روشن دیکھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس کی زبان نے جواب دے دیا اور اشک آلود آنکھوں نے زبان کا فرض ادا کیا۔

دوشیزہ نے اسے گلے لگایا، ہونٹوں اور آنکھوں کو بوسہ دیا، گرم گرم کلوں کو چوما اور

بانسری سے زیادہ شیریں آواز میں بولی:

میرے محبوب! میں نے تمہیں خوابوں میں دیکھا ہے تنہائیوں میں تمہارے تصور سے جی بہلایا ہے، تم میری روح کے رفیق ہو، جسے میں نے گم کر دیا تھا، تم میری ذات کے حسین نصف آخر ہو جو اس دنیا میں آنے سے پہلے مجھ سے جدا کر لیا گیا تھا۔

میں چوری چھپے تم سے ملنے آئی ہوں، میرے حبیب! دیکھو، اس وقت تم میری آغوش میں ہو۔ پریشان نہ ہو! میں اپنے باپ کے جاہ و چشم پر لات مار کر آئی ہوں، تاکہ تمہارے ہمراہ کسی دور دراز مقام پر چلی جاؤں اور ہم دونوں زندگی اور موت کے جام ایک ساتھ پئیں۔

اٹھو، میرے پیارے! ہم انسانوں سے دور، بہت دور، کسی ویرانے میں چلیں

وہ دونوں ایک دوسرے کو چاہنے والے درختوں میں سے ہو کر کہیں چلے گئے، رات کے پردوں نے انہیں روپوش کر دیا تھا، اور وہ بادشاہ کی قوت اور ظلمت کی پرچھائیوں سے بے خوف چلے جا رہے تھے۔

شاہی جاسوسوں کو شہر کے آس پاس دو انسانی ڈھانچے ملے جن میں سے ایک کے گلے میں ہار تھا۔ قریب ہی ایک پتھر پڑا تھا، جس پر یہ الفاظ کندہ تھے۔

”ہمیں محبت نے ملایا ہے، پھر کون ہے، جو ہمیں جدا کر سکے؟ ہمیں موت نے اپنی پناہ میں لے لیا ہے، پھر کون ہے جو ہمیں اس کی پناہ سے نکال سکے؟“

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

شاعر

ایک کڑی، جو اس عالم کو آنے والے عالم سے ملاتی ہے!

ایک شیریں چشمہ، جس سے پیاسی روحیں پانی پیتی ہیں!

دریائے حسن کے کنارے، ایک درخت، جس کے پکے ہوئے پھول بھوکے دلوں کی غذائیں!

کلام کی شاخوں پر پھدکنے وال بلبل، جس کے نغمے جس کی خلاؤں کو رقت و لطافت سے پر کر دیتے ہیں! ایک سفید بادل، جو خط شفق پر نمودار ہو کر پھیلتا ہے، بلند ہوتا ہے اور آسمان پر چھا جاتا ہے، پھر برستا ہے تاکہ چمن حیات کے پھولوں کو سیراب کرے!

ایک پھیلی ہوئی روشنی، جسے تاریکی چھپا سکتی ہے، نہ اس پر غالب آ سکی ہے!

ایک چراغ، جسے محبت کی دیوی عشتروت نے تیل سے بھرا اور موسیقی کے دیوتا اپالو نے روشن کیا۔

ایک تنہا انسان، جس کا لباس، سادگی اور غذا، لطافت ہے۔ جو شجر حیات کے سائے میں بیٹھ کر ایجاد و اختراع کا سبق پڑھتا اور رات کی خاموشی میں جاگ کر نزول روح کا انتظار کرتا ہے!

ایک کسان، جو احساسات کے مرغزار میں اپنے دل کے بیج بوتا ہے، جو اس سرسبز کھیتی کی شکل میں نمودار ہوتے ہیں، جسے انسانیت اپنی غذا بناتی ہے۔

یہی ہے وہ شاعر، جسے لوگ زندگی میں کوڑی کو نہیں پوچھتے اور اس کی قدر و قیمت اس وقت پہچانتے ہیں، جب وہ اس دنیا کو خیرباد کہہ کر اپنے سماوی وطن کی راہ لیتا ہے۔ یہی ہے وہ، جو انسان سے ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے سوا کچھ نہیں چاہتا، یہی ہے وہ، جس کے انفاس بلند ہوتے ہیں اور فضا کو زندہ اور حسین پرچھائیوں سے لبریز کر دیتے ہیں۔ لیکن انسان اسے کھانے کے لئے روٹی کے چند ٹکڑے اور رہنے کے

لئے چند گز زمین دینے میں بھی بخل سے کام لیتا ہے۔

اے انسان! کب تک؟ اے کارگاہ وجود! کب تک ان لوگوں کے لئے فخر و مسرت سے مکان بناتی رہے گی جو زمین کو خون کے چھینٹوں سے رنگین کرتے ہیں؟ اور کب تک بے پرواہی سے ان لوگوں کو نظر انداز کرتی رہے گی، جو ذاتی خوبیوں سے تجھے امن و سلامتی کا تحفہ دیتے ہیں، تو کب تک قاتلوں اور ان لوگوں کی تعظیم کرتی رہے گی، جو اپنی گردنوں پر غلامی کا جورا کھ لیتے ہیں۔ اور کب تک ان ہستیوں کا فراموش کرتی رہے گی، جو رات کی تاریکی میں اپنی آنکھوں کا نور برساتی ہیں تاکہ تجھے دن کی روشنی کا نظارہ کرنا سکھائیں اور ساری عمر بدبختی کے چنگل میں پھنسی رہتی ہے اس خیال سے کہ کہیں تو خوش بختی کی لذت کو نہ گنوا بیٹھے!

اور تم، اے شاعرو! اس زندگی وک زندگی کا روپ دینے والو! تم قدموں کی سنگدلی سے تنگ آ کر قوموں پر غالب آ گئے ہو اور غرور کے کانٹوں سے غضبناک ہو کر تم نے غار کے تاجوں کو تتر بتر کر دیا ہے!

اے شاعرو! تم نے دلوں پر قبضہ جما لیا ہے اور تمہارے قبضہ کی کوئی حد نہیں ہے۔

☆☆☆☆☆

زمانہ اور قوم

لبنان کے دامن میں، نہر کے کنارے جو چٹانوں میں بہتی ایسی معلوم ہو رہی تھی جیسے چاندی کے تارے ایک بھیڑیں چرانے والی بیٹھی تھی۔ اس کے چاروں طرف سوکھی دبلی بھیڑوں کا ریوڑ تھا، جو تازہ کانٹوں کے درمیان سوکھی گھاس چر رہا تھا یہ نو خیز لڑکی دور افق کی طرف دیکھ رہی تھی گویا فضا کے صفحات پر مستقبل کے واقعات کا مطالعہ کر رہی ہے۔ آنسو اس کی آنکھوں میں اس طرح چمک رہے تھے، جیسے نرگس کے پھولوں پر شبنم کے قطرے چمکتے ہیں اور مایوسی نے اس کے لبوں کو اس طرح وا کر دیا تھا، گویا اس کے دل کی آہوں میں تبدیل کر کے سلب کر لینا چاہتی ہے۔

جب شام ہوئی اور ٹیلے سائے کی چادر اوڑھنے لگے تو اچانک ایک بوڑھا اس نوجوان لڑکی کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ جس کے سفید بال سینہ اور شانوں پر بکھرے ہوئے تھے اور سیدھے ہاتھ میں ایک تیز درانتی تھی۔ ایسے لہجہ میں جو موجوں کی گڑگڑاہٹ سے مشابہ تھا، اس نے کہا:

’’سلام! اے سیریا!‘‘

لڑکی سہم کر کھڑی ہو گئی اور ایسی آواز میں، جسے خوف منقطع کر رہا تھا اور اداسی مربوط، اس نے کہا:

’’زمانہ! اب تو مجھ سے کیا چاہتا ہے؟‘‘

یہ کہہ کر اپنی بھیڑوں کی طرف اشارہ کیا اور سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولی:

جن بھیڑوں سے کبھی وادی بھری رہتی تھی، اب ان میں سے صرف یہ باقی ہیں، بس یہی ہیں وہ بھیڑیں، جو تیرے دندان حرص و آزار سے بچ گئی تھیں، تو کیا تو ان میں سے کچھ اور بھیڑیں چاہتا ہے؟

یہی ہیں وہ چراگاہیں، جنہیں میں تیرے قدموں سے پامال دیکھ رہی ہوں، حالانکہ یہی چراگاہیں کبھی سرسبز اور وسائل معاش کا ہر چشمہ تھیں، میری بھیڑیں ان

میں پھول کھاتی تھیں اور پاک وصاف دودھ دیتی تھیں۔ لیکن اب ان بھیڑوں کو دیکھ! ان کے پیٹ خالی ہیں اور یہ موت سے بچنے کے لئے کانٹے اور درختوں کی جڑیں چپارہی ہیں:

زمانہ! خدا سے ڈر اور میری آنکھوں سے دور ہو جا! تیرے مظالم کی یاد نے مجھے زندگی سے بیزار کر دیا ہے اور تیری درانتی کی تیزی کے سبب میں موت سے محبت کرنے لگی ہوں۔

مجھے تنہا چھوڑ دے! تاکہ میں آنسوؤں کی شراب پیتی رہوں اور نسیم غم کی موجوں میں سانس لیتی رہوں۔

جا! اے زمانہ! مغرب میں جا! جہاں لوگ زندگی کی مسرتوں سے شادکام ہیں اور مجھے ان بربادیوں پر ماتم کرنے کے لئے چھوڑ دے، جو تیرے صدقہ میں ہم پر نازل ہوئی ہیں۔

بوڑھے نے باپ کی سی شفقت سے اس کی طرف دیکھا اور درانتی اپنے کپڑوں میں چھپا کر بولا:

''سیریا! میں نے جو کچھ تجھ سے لیا ہے، وہ میری ہی بخشش وعطا کا ایک حصہ ہے۔ میں غارتگر ہرگز نہیں ہوں، جو کچھ کسی سے لیتا ہوں، مستعار لیتا ہوں اور جوں کا توں واپس کر دیتا ہوں۔ تجھے معلوم ہونا چاہئے کہ مجدوشرف کی خدمت سے حاصل کیا ہے، جو کبھی تیرے غلام تھا، انہوں نے اپنا حق وہی چادر اوڑھ کر حاصل کیا ہے، جو کبھی تیرے لئے تھی میں اور انصاف ایک ہی ذات کے دو جوہر ہیں، اس لئے مجھے زیب نہیں دیتا کہ میں تیری بہنوں کو وہ نہ دوں، جو تجھے عطا کیا تھا۔ اور نہ میں اس پر قادر ہوں کہ اپنی محبت میں جانبداری سے کام لوں اس لئے کہ محبت کی تقسیم تو از روئے انصاف ہی ہوتی ہے۔''

سیریا! تجھے اپنے ہمسایہ ممالک مصر، ایران اور یونان سے سبق لینا چاہئے کہ ان کی

بھیڑیں بھی تیری بھیڑوں کی طرح سوکھی دبلی اور ان کی چراگاہیں بھی تیری چراگاہوں کی طرح بے آب وگیاہ ہیں۔

سیریا! جسے تو انحطاط و زوال سے تعبیر کر رہی ہے، میں اسے ضروری نیند سمجھتا اور کہتا ہوں، جس کے نتیجہ میں حرکت وعمل کی عشرتیں حاصل ہوتی ہیں۔ پھول حیات تازہ سے ہمکنار نہیں ہوتا، جب تک موت سے ہم آغوش نہ ہو اور محبت، عظمت کے اوج کمال پر نہیں پہنچتی، جب تک فراق وہجر کی تنگ وتاریک گھاٹیاں طے نہ کرے!

بوڑھا، نوجوان لڑکی سے اور قریب ہوگیا اور اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا:

”اے پیغمبروں کی بیٹی! مجھ سے ہاتھ ملا:“

نوجوان لڑکی نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے اشک آلود آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولی:

”الوداع! اے زمانہ الوداع!“

”رخصت! اے سیریا! پھر کبھی ملیں گے!“

زمانہ روپوش ہوگیا، جس طرح بجلی چھپ جاتی ہے۔ لڑکی نے اپنی بھیڑوں کو پکارا، اور ان کے آگے، دل ہی میں یہ فقرہ دہراتی، چلنے لگی:

”کیا پھر ملاقات ہوگی؟ کیا پھر ملاقات ہو سکتی ہے؟“

☆☆☆☆☆

آتشیں حروف

کیا راتیں ہم پر اسی طرح گزرتی رہیں گی؟ کیا زمانہ کے قدموں تلے ہم اسی طرح پامال ہوتے رہیں گے؟ کیا قومیں، اپنی تہوں میں ہمیں اسی طرح لپیٹتی رہیں گی، اور ہمارے نام کے سوا، جسے وہ روشنائی کی بجائے پانی سے کتاب روزگار پر لکھیں گی، ہماری کوئی حفاظت نہ کریں گی؟

کیا یہ روشنی بجھ جائے گی؟ یہ محبت فنا ہو جائے گی؟ اور یہ تمنائیں مٹ جائیں گی؟

کیا موت ہر اس چیز کو ڈھا دے گی، جو ہم نے بنائی ہے؟ کیا ہوا ہر اس بات کو منتشر کر دے گی، جو ہمارے منہ سے نکلی ہے؟ اور کیا تاریکی ہر اس فعل کو چھپا دے گی، جو ہم سے صادر ہوا ہے؟

کیا یہی ''زندگی'' ہے؟ کیا یہی ''ماضی'' ہے؟ جو اس طرح گزر گیا کہ اس کے نشانات بھی ہماری آنکھوں سے پوشیدہ ہو گئے! کیا یہی ''حال'' ہے؟ جو ماضی کے پیچھے پیچھے دوڑ رہا ہے! اور کیا یہی ''مستقبل'' ہے جو ''حال'' یا ''ماضی'' ہوئے بغیر، بالکل بے معنی ہے!

کیا ہمارے دل کی تمام مسرتیں اور ہماری روح کے سارے غم زائل ہو جائیں گے؟ بغیر اس کے کہ ہم ان کے نتیجوں سے واقف ہوں؟

کیا انسان اسی طرح رہے گا؟ اس بلبلے کی مثال، جو تھوڑی دیر کے لئے سطح سمندر پر نمودار ہوتا ہے، لیکن جب ہوا کے جھونکے آتے ہیں، تو پھوٹ جاتا ہے گویا کبھی تھا ہی نہیں!

نہیں! اپنی زندگی کی قسم! کبھی نہیں! زندگی کی حقیقت زندگی ہے وہ زندگی، جس کا آغاز رحم مادر سے ہوتا ہے، نہ خاتمہ قبر میں۔ یہ ماہ و سال اس ازلی اور ابدی حیات کے ایک لحظہ کے سوا کچھ نہیں! یہ دنیوی زندگی، اپنے تمام متعلقات کے ساتھ، ایک نیند ہے، اس بیداری کے ہم پہلو جسے ہم ''ڈراؤنی موت'' کہتے ہیں، ایک ایسا

خواب ہے کہ جو کچھ ہم اس میں دیکھتے اور کرتے ہیں، وہ بقائے الٰہی کے ساتھ وابستہ ہے!

فضا، ان تمام مسکراہٹوں اور آہوں کو اپنی آغوش میں لے لیتی ہے جو ہمارے دل سے نکلتی ہیں۔ اور ان بوسوں کی آواز کو محفوظ کر لیتی ہے جس کا سرچشمہ محبت ہے۔ فرشتے آنسوؤں کے ان قطروں کو نگاہ میں رکھتے ہیں، جنھیں غم ہماری آنکھوں سے بہاتا ہے، اور وہ نغمے، فضائے لانہایت میں اڑنے والی روحوں کو سناتے ہیں، جنھیں فرحت ہمارے محسوسات میں پیدا کرتی ہے۔

وہاں آنے والی زندگی میں ہم اپنے جذبات کی تمام موجیں اور اپنے دل کی تمام جنبشیں دیکھیں گے۔ وہاں ہم اپنی الوہیت کو پہچانیں گے جسے اب یاس و ناامیدی کے اثرات کی بنا پر، حقارت سے دیکھتے ہیں۔

گمراہی جسے آج ہم کمزوری کے نام سے پکارتے ہیں، کل ہماری ہستی کا وہ حلقہ بن کر ظاہر ہو گی، جو انسان کے سلسلہ زندگی کی تکمیل کے لئے ضروری ہے۔

مشقت جسے اب ہم اپنی برداشت سے باہر سمجھتے ہیں، ہمارے ساتھ زندہ رہے گی اور ہماری عظمت و بزرگی کا سبب بنے گی۔

تکلیف، جو آج ہم بادل ناخواستہ سہہ رہے ہیں کل ہمارے لئے فکر کا تاج ہو گی۔

جان کیٹس وہ بلبل خوش نوا، اگر یہ جانتا کہ اس کے نغمے انسان کے دل میں ہمیشہ محبت حسن و جمال سے محبت کی روح پھونکتے رہیں گے تو کہتا:

''میری قبر پر کندہ کر دو:''

یہاں اس شخص کی ہڈیاں ہیں، جس کا نام آسمان پر آتشیں حروف سے لکھا گیا ہے۔

☆☆☆☆☆

مستقبل

حال کی دیواروں کے پیچھے میں نے انسانیت کے نغمہ ہائے عبودیت سنے، گھنٹوں کی آوازیں سنیں، جو عبادت گاہ جمال میں آغاز عبادت کا اعلان کرتی ہوئی، ایتھر کے ذرات کو متحرک کر رہی تھیں ہاں! ان گھنٹوں کی آوازیں سنیں جنہیں قوت نے احساسات کی دھات کو پگھلا کر بنایا اور اپنے مقدس ہیکل قلب انسانی پر لٹکا دیا تھا!

مستقبل کے پیچھے میں نے دیکھا کہ وہ مشرق کی طرف منہ کئے فطرت کے سینہ پر سر بہ سجدہ ہے، اور صبح حقیقت کے ہجوم نور کا منتظر ہے!

میں نے تباہ شدہ شہر کو دیکھا، جس کے آثار میں سے، شبنم کے ان چند تازہ قطروں کے سوا کچھ باقی نہ تھا، جو لوگوں کو نور کے مقابلہ میں ظلمت کی شکست کا حال سنا رہے تھے۔

میں نے ادھیڑ عمر کے لوگوں کو بید اور چنار کے سائے میں بیٹھے دیکھا، جن کے چاروں طرف لڑکے بیٹھے، زمانہ کے واقعات سن رہے تھے۔

میں نے نوجوانوں کو دیکھا، جو سرود اور بانسری بجا رہے تھے اور نوخیز لڑکیاں، بال کھولے، ان کے اردگرد، یاسمین کی شاخوں تلے ناچ رہی تھیں۔

میں نے بوڑھوں کو دیکھا، جو کھیت کاٹ رہے تھے اور عورتیں اناج کی ٹوکریاں اپنے سروں پر رکھے، عشرت و مسرت کے راگ گا رہی تھیں۔

میں نے انسان اور دوسری مخلوق کے درمیان محبت کا رشتہ استوار پایا، چنانچہ پرندوں اور تتلیوں کے پرے، بے خوف ہو کر انسان کے قریب آ رہے تھے اور ہرنوں کی ڈار اطمینان سے چشموں پر جھکی ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا تو فقیری تھی نہ سرمایہ داری، بلکہ اخوت و مساوات کا دور دورہ تھا۔ مجھے ڈاکٹر نظر نہ آیا، اس لئے کہ اپنی سوجھ بوجھ کی بنا پر، ہر شخص اپنا معالج آپ تھا۔ نہ مجھے کوئی پادری دکھائی دیا اس لئے کہ سب سے بڑا کاہن ضمیر تھا۔ وہاں کسی وکیل کا بھی وجود نہ تھا۔ اس لئے کہ

عدالت کی جگہ فطرت نے لے لی تھی اور وہی محبت اور دوستی کے عہد ناموں کی تصدیق وتوثیق کر رہی تھی۔

میں نے دیکھا: انسان اس حقیقت سے آشنا ہوگیا ہے کہ وہی مخلوقات کے زاویئے کا مرکز ہے، اس لئے وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کی پروانہیں کرتا اور ذلیل حرکات سے بلند ہوگیا ہے۔ اس نے ذہنی بصیرت کی آنکھ سے شک وشبہ کے پردے ہٹا دیئے ہیں، جس کی بنا پر وہ ان عبارتوں کو پڑھنے لگا ہے، جو بادل صفحہ آسمان پر لکھتے ہیں، اور نسیم کی موجیں سطح آب پر، اب وہ پھولوں کے انفاس کی لم اور بلبل اور کوئل کے نغموں کا مطلب سمجھنے لگا ہے۔

حال کی دیواروں کے پیچھے مستقبل کے اسٹیج پر میں نے دیکھا کہ جمال دولہا ہے اور روح اس کی دلہن اور زندگی اپنے تمام متعلقات کے ساتھ ان کی شب زفاف!

☆☆☆☆☆

بوڑھی ملکہ

چار غلام ایک بوڑھی ملکہ کو جو تخت پر محوِ خواب تھی کھڑے پنکھا جھل رہے تھے۔ ملکہ خراٹے لے رہی تھی اس کی گود میں ایک بلی لیٹی غرا رہی تھی اور غلاموں کی طرح ستائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

پہلے غلام نے کہا ''بوڑھیا نیند میں کس قدر بدصورت نظر آتی ہے۔ دیکھو تو اس کا چہرہ کیسے لٹک گیا ہے۔ اور سانس کس طرح لے رہی ہے۔ جیسے شیطان اس کا گلا گھونٹ رہا ہو۔''

بلی نے غراتے ہوئے کہا ''یہ نیند کے عالم میں اتنی بدنما معلوم نہیں ہوتی جتنے کہ تم غلام، بیداری کی حالت میں معلوم ہوتے ہو۔''

دوسرے غلام نے کہا ''تم یہ سوچ رہے ہو گے کہ نیند میں اس کی جھریاں گہری ہونے کے بجائے نکھر رہی ہیں۔ یہ ضرور کوئی برا خواب دیکھ رہی ہے۔''

بلی نے غرا کر کہا ''کاش تم بھی سو کر اپنی آزادی کے خواب دیکھتے۔''

تیسرے غلام نے کہا ''غالباً یہ ان لوگوں کا جلوس دیکھ رہی ہے جو اس نے قتل کیے۔''

بلی نے غراتے ہوئے کہا ''ہاں یہ تمہارے آباؤ اجداد اور تمہارے ورثا کا جلوس دیکھ رہی ہے۔''

چوتھے غلام نے کہا ''اس کے متعلق باتیں کرنا تو ایک اچھا مشغلہ ہے لیکن کھڑے کھڑے پنکھا جھلنا کچھ کم مصیبت نہیں۔''

بلی نے غراتے ہوئے کہا ''تم ابد تک پنکھا جھلتے رہو گے۔ جیسے تم زمین پر ہو، ویسے ہی تم آسمان پر رہو گے۔''

اس وقت بوڑھی ملکہ نے سوتے میں اپنے سر کو جھٹکا دیا اور اس کا تاج زمین پر آ گرا۔

ایک غلام نے کہا ’’یہ برا شگون ہے۔‘‘

اور بلی نے غرا کر کہا ’’ایک شخص کا برا شگون دوسرے کے لئے نیک شگون ہوتا ہے۔‘‘

دوسرے غلام نے کہا ’’اگر یہ بیدار ہو جائے۔ اور اپنا تاج زمین پر گرا ہوا پائے تو یقیناً ہمیں قتل کر دے۔‘‘

بلی نے غراتے ہوئے کہا ’’تمہاری پیدائش کے وقت سے یہ تمہیں ہر روز قتل کر رہی ہے لیکن تم نہیں جانتے‘‘

تیسرے غلام نے کہا ’’ہاں یہ ہمیں قتل کر دے گی۔ اور اسے دیوتاؤں کی قربانی تصور کرے گی۔‘‘

بلی نے غرا کر کہا ’’صرف کمزور ہی دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھائے جاتے ہیں۔‘‘

چوتھے غلام نے دوسرے غلاموں کو چپ کراتے ہوئے اور ملکہ کو بیدار کیے بغیر آہستہ سے تاج اٹھا کر اس کے سر پر رکھ دیا۔

بلی نے غراتے ہوئے کہا ’’صرف ایک غلام ہی گرے ہوئے تاج کو دوبارہ اس کی جگہ پر رکھ سکتا ہے۔‘‘

کچھ دیر بعد بوڑھی ملکہ بیدار ہوئی۔ اس نے اپنے اردگرد دیکھا اور ایک جمائی لی اور کہا ’’میرا خیال ہے کہ میں ایک خواب دیکھ رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ایک بچھو شاہ بلوط کے ایک پرانے درخت کے اردگرد چار کیچوؤں کا تعاقب کر رہا ہے۔ یہ خواب مجھے پسند نہیں۔ یہ کہہ کر وہ پھر آنکھیں بند کر کے سو گئی۔ اور خراٹے لینا شروع کر دیئے چاروں غلام اسے پنکھا جھلتے رہے۔‘‘

بلی نے غرا کر کہا ’’جھلتے جاؤ ہاں پنکھا جھلتے جاؤ بیوقوفو اور اس آگ کو ہوا دیتے جاؤ۔ جو تمہیں لپیٹ میں لے رہی ہے۔‘‘

☆☆☆☆☆

تارک الدنیا

میں جوانی کے عالم میں ایک مرتبہ ایک تارک الدنیا شخص سے ملا۔ جو پہاڑیوں سے پرے ایک خاموش اور پرسکون وادی میں رہتا تھا۔ ہم نیکی کی حقیقت پر گفتگو کر رہے تھے کہ ایک تھکا ماندہ ڈاکو پہاڑی سے لنگڑاتا ہوا آیا۔ جب وہ کنج کے پاس پہنچا تو وہ درویش کے سامنے جھکا اور بولا

''سائیں بابا کیا مجھے آرام ملے گا۔ میں گناہوں سے دبا ہوا ہوں۔''

درویش نے جواب دیا ''میں خود بھی اپنے گناہوں سے دبا ہوا ہوں''

ڈاکو نے کہا لیکن میں چور اور لٹیرا ہوں۔

درویش نے جواب دیا میں خود بھی ایک چور اور لٹیرا ہوں۔

ڈاکو نے کہا ''لیکن میں خونی ہوں اور لاتعداد انسانوں کا خون میرے کانوں میں چیخ رہا ہے۔''

درویش بولا ''میں خود بھی ایک قاتل ہوں اور بے شمار انسانوں کا خون میرے کانوں میں چیخ رہا ہے۔''

ڈاکو نے کہا ''میں نے ان گنت جرم کیے ہیں۔''

درویش کہنے لگا ''میں نے خود بھی لاتعداد جرم کیے ہیں۔''

تب وہ ڈاکو اٹھ کھڑا ہوا۔ اور درویش کو دیکھا اور اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی تھکاوٹ تھی۔ اور جب وہ ہم سے الگ ہوا تو وہ پہاڑی سے جست لگاتا گیا۔

میں درویش سے مخاطب ہوا اور کہا ''آپ نے خود کو ناکردہ گناہوں کا مجرم یوں ٹھہرایا۔ کیا آپ کا یہ خیال نہیں کہ یہ آدمی آپ سے بدظن ہو کر گیا ہے۔''

درویش نے جواب دیا ''یہ درست ہے کہ اب اسے مجھ پر اعتقاد نہیں رہا لیکن وہ یہاں سے بے حد مطمئن گیا ہے۔''

اس وقت ہم نے ڈاکو کو کچھ فاصلے پر گاتے ہوئے سنا۔ اس کے گیت کی گونج وادی کو مسرت سے لبریز کر رہی تھی۔

ہوسِ اقتدار

ایک دفعہ میں نے ایک انسانی سر اور لوہے کے پاؤں والا دیو دیکھا جو پیہم زمین کو کھاتا اور سمندر کو پیتا تھا میں دیر تک اسے دیکھتا رہا پھر میں اس کے قریب گیا اور پوچھا ’’ کیا یہ تمہارے لئے کافی نہیں؟ تم کبھی سیر نہیں ہوئے اور تمہاری پیاس کبھی نہیں بجھی؟‘‘

اور اس نے جواب دیا ’’ہاں، میں مطمئن ہوں، نہیں میں کھانے پینے سے اکتا گیا۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے، کہ کل میرے کھانے کے لئے نہ زمین باقی رہے گی اور نہ پینے کے لئے کوئی سمندر۔‘‘

☆☆☆☆☆

چار شاعر

چار شاعر شراب کے ایک پیالہ کے گرد بیٹھے تھے جو میز پر رکھا تھا۔

پہلے شاعر نے کہا ''میرا خیال ہے کہ میں اپنی تیسری آنکھ سے اس شراب کی مہک کو وسعت پر ایسے منڈلاتے ہوئے دیکھ رہا ہوں جیسے کسی سحر زدہ جنگل پر پرندوں کا ایک جھلر۔''

دوسرے شاعر نے اپنا سر اٹھا اور کہا ''میں اپنے باطنی کان سے ان موہوم پرندوں کو گاتے ہوئے سن رہا ہوں۔ اور ان کا نغمہ میرے دل کو یوں تھامے ہوئے ہے۔ جیسے سفید گلاب شہد کی مکھی کو اپنی پنکھڑیوں میں قید کر لیتا ہے۔''

تیسرے شاعر نے آنکھیں بند کرتے ہوئے اور آسمان کی طرف بازو پھیلاتے ہوئے کہا۔ ''میرا ہاتھ انہیں چھو رہا ہے اور میں ان پرندوں کے پروں کو یوں محسوس کر رہا ہو جیسے محوِ خواب حسن کی سانس میری انگلیوں سے ٹکرا رہی ہو۔''

تب چوتھا اٹھا اور پیالے کو بلند کرتے ہوئے کہا ''افسوس دوستو میں تمہاری طرح دیکھنے سننے اور چھونے کی ان صلاحیتوں سے اس قدر محروم ہوں کہ میں اس شراب کی مہک نہیں دیکھ سکتا اور نہ موہوم پرندوں کا کوئی نغمہ سن سکتا ہوں اور نہ ان کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ ہی کو محسوس کر سکتا ہوں میں صرف شراب دیکھتا ہوں شراب اور مجھے اب اسے پینا ہی ہوگا۔ تاکہ اس سے میرے حواس میں بھی تیزی پیدا ہو جائے اور میں تمہارے تخیل کی بلندیوں تک پہنچ سکوں۔''

اور پیالے کو اپنے لبوں سے لگاتے ہوئے وہ شراب کی تلچھٹ تک پی گیا۔

تینوں شاعر حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ ان کی آنکھوں میں ایک غیر شاعرانہ اور پیاسی نفرت تھی۔

☆☆☆☆☆

لہروں کا گیت

مضبوط ساحل میرا محبوب ہے اور میں اس کی محبوبہ ہوں۔

محبت ہمیں ایک دوسرے سے کبھی نہ کبھی ملا دیتی ہے اور پھر چاند مداخلت کرتا ہے اور ہمیں جدا کر دیتا ہے۔

میں تیزی سے اس کی طرف جاتی ہوں اور پھر جدا ہو جاتی ہوں۔

گہرے رنج کے ساتھ ہم ایک دوسرے کو الوداع کہتے ہیں میں گہرے نیلے افق سے نکل کر چپکے سے ساحل کی طرف بڑھتی ہوں اور اس کے لئے ریت کے سونے کا ایک تحفہ لاتی ہوں۔ پھر ہم نہایت مسرت سے ہم آغوش ہو جاتے ہیں۔

میں اس کی پیاس بجھاتی ہوں اور دل کو حوصلہ دیتی ہوں۔

وہ میری آواز ملائم بناتا ہے اور میری برہمی کو کم کرتا ہے صبح سویرے میں اسے محبت کے گیت سناتی ہوں اور وہ فرط مسرت سے مجھے بھینچ لیتا ہے۔

جب جوار بھاٹا آتا ہے۔ میں اسے حوصلہ افزا اور امید کی جھلک دکھانے والے گیت سناتی ہوں۔

اور اس کے چہرہ پر بوسوں کے لطیف نشان چھوڑ کر جدا ہو جاتی ہوں۔

میں جذباتی اور خوف زدہ ہوں لیکن وہ سنجیدہ اور صابر ہے۔

اس کا کشادہ سینہ میرے غم کا خاتمہ کر دیتا ہے۔

جب جوار بھاٹا آتا ہے تو ہم ایک دوسرے کی دیکھ بھال کرتے ہیں اور جب جوار بھاٹا ختم ہوتا ہے، میں دعا کے لئے اس کے قدموں پر گر پڑتی ہوں۔

اکثر اوقات جب سمندری پریاں ستاروں کا نظارہ کرنے کے لئے سطح آب پر نمودار ہوتی ہیں، میں ان کے ساتھ رقص کرتی ہوں۔

میں نے اکثر اوقات محبت کرنے والوں کو اپنی تنگ دامانی اور بے بسی کی شکایت کرتے سنا ہے۔ میں ان کو سکون کا سامان بہم پہنچاتی ہوں۔

اکثر اوقات میں نے بڑی چٹانوں سے چھیڑ چھاڑ کی ہے اور مسکراتے ہوئے انہیں گدگدایا ہے۔ لیکن میں نے انہیں کبھی جواب میں مسکراتے نہیں دیکھا۔

بسا اوقات میں نے ڈوبنے والوں کو اوپر اٹھا کر اپنے ساحل تک پہنچایا ہے جو انہیں قوت بخشتا ہے جو اسے مجھ سے ملی ہے۔

بسا اوقات میں سمندر کی گہرائی سے موتی چرا کر اپنے محبوب ساحل کو دیئے ہیں وہ انہیں لے لیتا ہے اور میں تحفہ اسے دیتی رہتی ہوں کیونکہ وہ ہمیشہ میرا سواگت کرتا ہے۔

رات کے گہرے سناٹے میں جب کہ تمام مخلوق نیند کی گرفت میں ہوتی ہے۔ میں تھم کر گانے لگتی ہوں میں کبھی گاتی ہوں اور کبھی آہیں بھرتی ہوں میں ہمیشہ بیدار رہتی ہوں۔

آہ نیند نے مجھے کمزور بنا دیا ہے لیکن مجھے کوئی پرواہ نہیں کیونکہ محبت کی متوالی ہوں اور محبت ہر شے سے مضبوط اور اس کی عظمت نا قابل تسخیر ہے۔

یہ ممکن ہے کہ میں تھک جاؤں لیکن مجھے یقین ہے کہ موت مجھ پر غالب نہ آ سکے گی۔

☆☆☆☆☆

انصاف

ایک رات قصر شاہی میں ایک دعوت ہوئی۔ اس موقع پر ایک آدمی آیا اور اپنے آپ کو بادشاہ کے حضور میں پیش کیا۔ تمام مہمان اس کی طرف دیکھنے لگے۔ انہوں نے دیکھا کہ اس کی ایک آنکھ باہر نکل آئی ہے اور خالی جگہ سے خون بہہ رہا ہے۔

بادشاہ نے پوچھا

تم پر کیا مصیبت پڑی ہے

اس آدمی نے کہا

"عالی جاہ میں ایک پیشہ ور چور ہوں اور آج شب جبکہ چاند ابھی طلوع نہیں ہوا تھا میں ایک سیٹھ کی دکان لوٹنے گیا لیکن غلطی سے جلاہے کے گھر میں داخل ہو گیا۔ جونہی میں کھڑکی میں سے کودا، میرا سر جلاہے کے کرگھے سے ٹکرایا اور میری آنکھ پھوٹ گئی۔ عالی جاہ! میں اس جلاہے کے معاملے میں انصاف چاہتا ہوں۔ یہ سن کر بادشاہ نے جلاہے کو طلب کیا اور فیصلہ سنایا کہ جلاہے کی آنکھ نکال دی جائے۔"

جولاہا بولا

"جہاں پناہ! آپ کا یہ فیصلہ درست ہے کہ میری آنکھ نکال دی جائے لیکن عالی جاہ! میرے کام میں دونوں آنکھوں کی ضرورت ہے۔ تاکہ میں اس کپڑے کے دونوں حصوں کو دیکھ سکوں جسے میں بنتا ہوں۔ البتہ میرے پڑوس میں ایک موچی ہے جس کی دونوں آنکھیں سلامت ہیں۔ اس کو ویسے بھی ان دونوں آنکھوں کی ضرورت نہیں۔"

یہ سن کر بادشاہ نے موچی کو بلوایا اور اس کی ایک آنکھ نکلوا دی۔

اور اس طرح انصاف کا تقاضا پورا ہو گیا۔

☆☆☆☆☆

جب طوفان گزر گیا

لہلہاتے ہوئے کھیتوں کو زمین پر بچھا دینے اور بڑے بڑے درختوں کی مضبوط شاخوں کو توڑ دینے کے بعد طوفان تھم گیا اور اس طرح سناٹا چھا گیا۔ جیسے قدرت ہمیشہ سے پر امن رہی ہو۔ ستارے دوبارہ نظر آنے لگے۔

اسی وقت ایک نوجوان عورت اپنے کمرے میں داخل ہوئی اور اپنے بستر کے قریب گھٹنوں کے بل جھک گئی۔ وفور غم سے اس کا دل بھر آیا تھا۔ لیکن پھر بھی اس کی زبان سے یہ الفاظ نکلے۔

”میرے مالک اسے مجھ تک بخیریت پہنچا دے۔ میرے آنسو خشک ہو چکے ہیں اب میں مزید آنسو نہیں بہا سکتی۔ اے مالک اے رحمان اے رحیم! میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے اور صدمہ نے میرے دل میں گھر کر لیا ہے۔ میرے مالک اسے جنگ کی ہولناکیوں سے بچا۔ تو اسے بے رحم موت سے محفوظ رکھ وہ کمزور ہے اور طاقتور لوگوں کے بس میں ہے۔ اے مالک! میرے محبوب کو بچا۔ مجھے اس سے ملا دے یا ایسا ہو کہ وہ یہاں آ جائے۔ اور مجھے اپنے ساتھ لے کر چلا جائے۔“

اسی وقت ایک نوجوان مرد بڑی خاموشی سے کمرہ میں داخل ہوا اس کے جسم پر جگہ جگہ پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔

وہ اس عورت کے قریب پہنچ گیا اور غم اور خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اس نے عورت کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور پھر اپنے ہونٹوں سے لگایا۔ پھر ایک ایسی آواز کے ساتھ جس میں ماضی کا غم اور حال کی خوشی شامل تھی اس نے کہا مجھ سے مت ڈرو میں تمہاری دعاؤں کا مرکز ہوں، مسکراؤ۔ اس لئے کہ اس نے مجھے بخیریت تمہارے پاس پہنچا دیا ہے۔ اور انسانیت نے ہمیں وہ چیز واپس دلا دی ہے جسے دوسروں کی خود غرضی اور لالچ نے ہم سے چھیننا چاہا تھا۔ اس لئے رنج نہ کرو بلکہ مسکراؤ۔ میری پیاری اب خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے محبت ایسی

طاقت ہے جو موت کو شکست دے دیتی ہے۔ ایسا جادو ہے جو دشمن کو مغلوب کر لیتا ہے۔ ادھر دیکھو یہ میں ہوں تمہارا محبوب میں ایک تصور یا خواب نہیں جو موت کی وادی سے نکل کر آیا ہوں۔ میں حقیقت میں زندہ ہوں۔ ادھر دیکھو میری طرف۔

گھبراؤ نہیں، ادھر دیکھو میں ایسی سچ ہوں جو تلواروں اور توپوں کے بھیانک ماحول سے نکل کر آیا ہوں اور میں لوگوں کو جنگ پر محبت کے غلبہ کی داستان سناؤں گا۔

وہ اس سے زیادہ کچھ نہ بول سکا۔ اس کا دل بھر آیا اس کے آنسو دل کا پیغام سنانے لگے۔ اور مسرت کے فرشتے اس عمارت پر اپنا سایہ ڈالنے لگے اور پھر ان دونوں دلوں نے اس یک جائی کو دوبارہ پا لیا۔ جو ان سے چھین لی گئی تھی۔

اگلی صبح کو وہ دونوں ایک میدان میں کھڑے ہوئے قدرت کے اس حسن کا نظارہ کر رہے تھے۔ جس کل کا طوفان کسی حد تک زخمی کر چکا تھا۔

اطمینان کا ایک گہرا سانس لینے کے بعد سپاہی نے مشرق کی طرف دیکھا اور اپنی محبوبہ سے مخاطب ہوا۔

”پیاری ادھر دیکھو تاریکی نئے سورج کو جنم دے رہی ہے۔“

☆☆☆☆☆

بنفشہ کا پھول

خیابان چمن میں، ایک نظر فریب وخوشبودار اور بنفشہ کا پھول تھا، جو اپنے پڑوسیوں کے ساتھ سکون واطمینان کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اور لمبی لمبی گھاس کے حلقہ میں لہرا رہا تھا، ایک دن صبح کو جبکہ اس کے سر شبنم کا تاج رکھا تھا، اس نے سر اٹھا کر ادھر دیکھا اس کی نگاہ ایک نازک اندام وخوش قامت گلاب کے پھول پر پڑی۔ اس کا ”سر پر غرور“ اس طرح بلند تھا، گویا زمردیں چراغ دان پر آگ کا شعلہ لرز رہا ہے۔

بنفشہ کے پھول نے اپنے نیلگوں ہونٹ وا کیے اور سرد آہ بھر کر کہنے لگا۔

”نباتی خوشبوؤں میں میرا حصہ کتنا کم اور پھولوں میں میرا درجہ کس قدر پست ہے۔ قدرت نے مجھے حقیر و ذلیل بنا کر پیدا کیا ہے تاکہ میں زمین سے چمٹے چمٹے اپنی عمر گزار دوں، میں اپنا سر نیلگوں آسمان کی طرف اٹھا سکتا ہوں نہ اپنا رخ گلاب کے پھول کی طرح سورج کی طرف کر سکتا ہوں۔“

گلاب کے پھول نے اپنے پڑوسی بنفشہ کے پھول کی بات سنی اور قہقہہ مار کر کہنے لگا۔

”تو بھی پھولوں میں کتنا مورکھ ہے جو نعمت تجھے حاصل ہے۔ افسوس کہ تو اس کی قدر و قیمت سے واقف نہیں۔ تجھے قدرت نے وہ خوشبو، وہ حسن اور دلکشی عطا فرمائی ہے جس سے اکثر پھول محروم ہیں۔ اپنے دل کو ان نامحمود خیالوں اور شیطانی آرزوؤں سے پاک رکھ اور اپنی تقدیر پر شاکر رہ تجھے معلوم ہونا چاہئے کہ جس کسی نے اپنے بازوؤں کو نیچے کر لیا گویا اپنے مرتبہ کو بڑھا لیا اور جس کسی نے حرص و طمع کی، گویا نقصان کو دعوت دی۔“

بنفشہ کے پھول نے جواب دیا۔

”میاں گلاب! تم تسلی دے رہے ہو، اس لئے کہ تمہیں وہ تمام امتیازات حاصل ہیں جن کی مجھے آرزو ہے۔ تم تحکمانہ لہجے میں میرے احساس کمتری کو دور کرنا چاہ

رہے ہو، اس لئے تم بلند مرتبہ ہو، لیکن بدنصیب دلوں پر کامیابی و کامرانی کی نصیحتیں کیا اثر کر سکتی ہیں؟ اف! کس قدر سنگدل ہے، وہ طاقت ور، جو کمزوروں میں فصاحت و بلاغت کے دریاء بہائے!''

فطرت نے گلاب اور بنفشہ کے پھولوں کی گفتگو سنی اور متعجب ہو کر انگڑائی لی۔ پھر ذرا بلند آواز میں بولی۔

''میرے پیارے بنفشہ کے پھول! یہ تمہیں کیا ہو گیا؟ میں تو تمہیں، تمہاری عاجزہ کی بنا پر دلکش، نرمی و نزاکت کی بنا پر شیریں اور غریب بیچارگی کی بنا پر شریف سمجھتی تھی کیا مکروہ خوابوں نے تمہیں بھی گمراہ کر دیا، کھوکھلی''

عظمت نے تمہاری عقل بھی چھین لی؟

بنفشہ نے آرزومندانہ لہجے میں کہا

اے عظمت و جبروت کی دیوی! اے شفیق و مہربان ماں! میں اپنے دل کی تمام آرزوؤں اور اپنی روح کی تمام آرزوؤں اور اپنی روح کی تمام امیدوں کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ تو میری التجا قبول کر لے اور مجھے خواہ ایک ہی دن کے لئے سہی، لیکن گلاب کا پھول بنا دے!

فطرت نے غصہ سے جواب دیا۔

''تو نہیں جانتا کہ کیا مانگ رہا ہے؟ اور تجھے معلوم نہیں کہ ظاہری عظمت میں کتنی بلائیں پوشیدہ ہوتی ہیں اگر میں نے تیرا قدم بلند کر دیا اور تیری صورت بدل کر تجھے گلاب کے پھول بنا دیا تو اس وقت تجھے ندامت ہو گی۔ بے سود ندامت!''

بنفشہ نے کہا

''میرے بنفشی وجود کو کشیدہ قامت اور بلند سر گلاب کے پھول سے بدل دے، اس کے بعد جو کچھ ہو گا اس کی ذمہ داری تجھ پر نہیں میری حرص و طمع پر ہو گی''

فطرت نے جواب دیا۔

''اے نادان و سرکش بنفشہ! میں نے تیری التجا قبول کی لیکن اگر مشکلات و مصائب تجھے گھیر لیں تو اس کی شکایت مجھ سے نہیں، اپنی ذات سے کرنا!''

قدرت نے اپنی مخفی و سحر کار انگلیوں سے بنفشہ کی پتوں کو مس کیا اور چشم زدن میں اسے ایک خوش رنگ گلاب کا پھول بنا دیا جو تمام پھولوں سے بلند تھا۔

☆☆☆☆☆

دن ڈھلتے، فضا پر طوفان خیز سیاہ بادل چھا گئے، سکون ہستی میں ہیجان پیدا ہوا، بجلی چمکنے لگی، بادل گرجنے لگے اور باد و باراں کا لشکر جرار باغوں اور چمن زاروں سے آمادہ پیکار ہو گیا۔ شاخیں ٹوٹ کر گرنے لگیں۔ بڑے بڑے درخت جڑ سے اکھڑ گئے۔ سر بلند پھول طوفان کے تھپیڑوں سے مٹی میں مل گئے اور ان بیلوں اور پھولوں کے سوا کوئی چیز باقی نہ رہی جو زمین سے چمٹے ہوئے تھے یا چٹانوں میں پوشیدہ تھے۔

لیکن عناصر کے اس ہیجان نے دوسرے باغوں کو اتنا تباہ و برباد نہیں کیا جتنا اس چمن کو جس میں مادر قدرت نے بنفشہ کے پھول کو گلاب کا پھول بنایا تھا۔

چنانچہ جب طوفان فرو ہوا اور بادل چھٹے تو اس کے تمام پھول منتشر ذرات کی طرح ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے اور اس طوفان خیز ہنگامہ کے بعد کوئی چیز صحیح و سلامت نہ رہی۔ سوائے بنفشہ کے ان پھولوں کے جو چمکنی دیواروں تلے روپوش تھے۔

☆☆☆☆☆

بنفشہ کے ایک نو شگفتہ پھول نے سر اٹھا کر دیکھا کہ چمن کے پھولوں اور درختوں پر کیا بیتی؟ وہ خوشی سے مسکرایا اور اپنے ساتھیوں کو آواز دے کر کہنے لگا۔

''دیکھو! آندھی نے ان پھولوں کا کیا حشر کر دیا جو فخر غرور کے ساتھ سر اونچا کئے کھڑے تھے۔''

دوسرے بنفشہ کے پھول نے کہا

''ہر چند ہم زمین پر پڑے ہیں لیکن آندھی اور طوفان کے غیظ و غضب سے محفوظ

ہیں۔"

تیسرا بنفشہ کا پھول بولا۔

"یہ صحیح ہے کہ ہمارے جسم بہت حقیر ہیں لیکن تباہیاں ہم پر غالب نہیں آ سکتیں۔"

اس وقت بنفشہ کے پھولوں کے بادشاہ نے نگاہ اٹھائی اور دیکھا کہ اس کے پاس وہ گلاب کا پھول پڑا ہے جو کل تک بنفشہ کا پھول تھا۔ طوفان نے اسے شاخ سے اکھاڑ پھینکا ہے۔ آندھی کے تھپیڑوں نے اس کی پتی پتی الگ کر دی ہے اور اب وہ نم آلود گھاس پر اس طرح پڑا ہے جیسے کسی مقتول کے سینہ میں دشمن کا تیر پیوست ہو۔

بادشاہ نے اپنا سر اونچا کیا اور اس کی پتیاں ذرا پھیلیں اور اس نے اپنے ساتھیوں سے بلند آواز میں کہا۔

"دیکھو! ذرا اس بنفشہ کے پھول کو دیکھو! جس نے لالچ میں آ کر گلاب کے پھول کا لباس پہن لیا تا کہ تھوڑی سی دیر کے لئے سربلندی حاصل کرے اور ہمیشہ کے لئے پستی میں گر جائے یہ منظر تمہارے لئے عبرت کا سبب ہو گا۔"

یہ سن کر گلاب جو اس وقت جانکنی کے عالم میں تھا، مارے غصہ کے لرز اٹھا اس نے اپنی بچی کھچی قوتیں جمع کیں اور رک رک کر کہنے لگا۔

"سنو اے کم حوصلہ بے وقوفو! سنو! اے طوفان باد و باراں سے لرزہ براندام ہونے والو! کل تک میں تمہاری طرح اپنے سبز پتوں میں بیٹھا تقدیر پر قانع تھا اور یہ قناعت ایک دیوار حائل تھی جو مجھے زندگی کے طوفانوں اور ہنگاموں سے الگ رکھتی تھی، جس نے میرے وجود کو راحت واطمینان کے نشہ میں سرشار کر کے امن وسلامتی کے حلقہ میں گھیر رکھا تھا۔ میرے امکان میں تھا کہ میں اسی طرح زمین پر پڑے پڑے زندگی گزار دیتا، یہاں تک کہ موسم سرما اپنی برف باریوں سے مجھ پر چھا جاتا اور میں بھی اپنے پیش رو پھولوں کی طرح موت کی خاموش بستی میں پہنچ جاتا نیستی کی تاریکیوں میں گم ہو جاتا، اس سے پہلے کہ میں ہستی کے اسرار و رموز کو جانچتا جو سطح زمین پر نمودار

ہونے کے بعد سے بنفشہ کے پھولوں نے اختیار کر رکھا ہے۔''

ہاں! میرے امکان میں تھا کہ میں لالچ سے اپنا دامن پاک رکھتا اور ان چیزوں سے پرہیز کرتا جو اپنی فطرت کے پیش نظر، میری فطرت سے بلند ہیں لیکن میں نے رات کی خاموشی پر کان لگائے اور عالم قدس کو اس عالم سے کہتے سنا۔

''وجود کی غایت ہی یہ ہے کہ ماورائے وجود کے لئے جدوجہد کی جائے''

یہ سن کر میری روح میرے خلاف آمادہ بغاوت ہوگئی اور میرا وجدان اس مقام کے لئے تڑپنے لگا جو اس سے کہیں بلند تھا۔ میری روح بغاوت کرتی رہی اور میں اس بلند مقام کے لئے تڑپتا رہا۔ یہاں تک کہ میری سرکشی ایک فعال قوت سے بدل گئی اور میرا شوق ایک خلاق ارادہ سے، چنانچہ میں نے فطرت سے درخواست کی اور فطرت ہمارے پوشیدہ خیالات کے خارجی مظاہرہ کے سوا کچھ نہیں کہ مجھے گلاب کا پھول بنا دے اور اس نے میری درخواست قبول کرلی۔

یہ کوئی نئی بات نہ تھی، بارہا دیکھنے میں آیا ہے کہ فطرت نے اپنے آثار ونقوش اپنے ہاتھوں اور اپنی خوشی سے بدل کر رکھ دیئے ہیں۔

گلاب کا پھول تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہوگیا اس کے بعد فخر وامتیاز کے لہجہ میں بولا

''وہ ایک ساعت جو میں نے گلاب کے پھول کی حیثیت سے گزاری ہے در حقیقت ایک بادشاہ کی طرح گزاری ہے۔ میں نے کائنات کو گلاب کی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ایتھر کی سرگوشیوں کو گلاب کے کانوں سے سنا ہے اور نور کے دامن کو گلاب کی پتیوں سے چھوا ہے تم میں کوئی ہے جو اس شرف وامتیاز میں میری ہمسری کا دعویٰ کرے؟''

اس کی گردن جھک گئی اور اس نے ایسی آواز میں جس سے موت کا شدید کرب ظاہر ہوتا تھا کہا:

”میں اب مر رہا ہوں، مر رہا ہوں اور میری روح میں وہ کیفیت ہے جو مجھ سے پہلے بنفشہ کے کسی پھول میں نہ تھی، مجھے تمام وہ حقیقتیں معلوم ہیں جو اس محدود دائرہ کے پیچھے آسودہ ہیں جس میں میں پیدا ہوا تھا اور یہی زندگی کا مقصد ہے۔ ہاں! یہی وہ جوہر ہے، جو شب و روز کے پردہ میں روپوش ہے۔“

گلاب کی پتیاں مرجھا گئیں۔ اس میں قدرے لرزش پیدا ہوئی اور وہ مر گیا۔ اس کے چہرہ پر مقدس تبسم کھیل رہا تھا۔ میں ہستی کا تبسم جس نے اپنی بلند آرزوؤں سے زندگی کی تصدیق کر دی۔ فتح و کامرانی کا تبسم خداوندی تبسم!

☆☆☆☆☆

شاعراعظم

(بعلبک 112 ق م)

بادشاہ تخت زرنگاہ پر جلوہ افروز تھا۔ جس کے چاروں طرف شمعیں اور عود و لوبان کی انگیٹھیاں روشن تھیں۔ دائیں بائیں درباری امیر اور مذہبی پیشوا بیٹھے تھے اور سامنے غلام اور سپاہی اس طرح کھڑے تھے جیسے سورج کے سامنے مجسمے!

تھوڑی دیر کے بعد جب مطربوں کے نغمے ختم ہو کر رات کے سیاہ لباس کی تہوں میں گم ہو گئے تو وزیر اعظم اٹھا اور بادشاہ کے سامنے دست بستہ کھڑے ہو کر، بڑھاپے کی ناتواں آواز میں رک رک کر کہنے لگا۔

”جہاں پناہ! ہندوستان کا ایک عجیب و غریب فلسفی کل شہر میں وارد ہوا ہے۔ اس کی تعلیمات ایسی انوکھی ہیں کہ آج تک سننے میں نہیں آئیں۔ اس کا عقیدہ ہے کہ روح ایک جسم سے دوسرے جسم میں اور انسان ایک صدی سے دوسری صدی میں منتقل ہوتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ درجہ کمال کو پہنچ کر، دیوتاؤں کی صف میں شامل ہو جاتا ہے۔ اپنے اسی مذہب کی تبلیغ کے لئے وہ یہاں آیا ہے اور چاہتا ہے کہ آج کی رات شرف باریابی حاصل کر کے حضور کے سامنے اپنے عقائد کی وضاحت کرے!“

بادشاہ نے سر ہلایا اور مسکرا کر کہا۔

”ہندوستان سے ایسی ہی نرالی چیزیں آتی ہیں۔ اچھا! اسے حاضر کرو!“

مابدولت اس کے دلائل سننا چاہتے ہیں۔

اسی لمحہ ایک ادھیڑ عمر کا انسان دربار میں حاضر کیا گیا۔ جس کا رنگ گندمی، چہرہ پر وقار، آنکھیں بڑی بڑی اور شگفتہ خدوخال، زبان بے زبانی میں گہرے رازوں اور انوکھی رغبتوں کے ترجمان تھے۔ آداب بجا لانے کے بعد، اجازت پا کر اس نے اپنا سر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی اور وہ اپنے نئے عقیدہ اظہار کرنے لگے۔ اس نے بتایا روح اپنے اختیار کردہ درمیانی واسطوں اور حاصل کردہ تجربات

کی تاثیرات کے ذریعہ درجہ بدرجہ ترقی کرتے ہوئے رفعت و قوت عطا کرنے والی محبت کے ساتھ نشوونما پاتے ہوئے کس طرح ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل ہوتی ہے۔ پھر اس نے بیان کیا کہ انسان، کمالیاتی ضرورتوں کی ٹوہ لگاتے ہوئے دور موجود میں عہد ماضی کے گناہوں کا کفارہ ادا کرتے ہوئے، اور ایک جون کی بوئی ہوئی کھیتی دوسری جون میں کاٹتے ہوئے کس طرح نقل مکانی کرتا ہے۔

جب تقریر نے طول کھینچا اور بادشاہ کے چہرے پر بے چینی اور تکان کی علامات ظاہر ہونے لگیں تو وزیر اعظم نووارد فلسفی کے قریب آیا اور اس کے کان میں چپکے سے کہا۔

”بس! بحث کو اب کسی اور فرصت کے لئے اٹھا رکھو۔“

فلسفی الٹے پاؤں لوٹا اور مذہبی پیشواؤں کی صف میں بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ گویا ہستی کے رموز و اسرار کو غور سے دیکھتے دیکھتے تھک گیا ہے۔

تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد، جو پیغمبرانہ سکر و بے خبری سے مشابہ تھی، بادشاہ نے دائیں بائیں دیکھ کر پوچھا۔

”ہمارا شاعر کہاں ہے؟ ہم نے اسے مدت سے نہیں دیکھا۔ اس پر کیا بیتی؟ وہ ہر رات ہماری مجلس میں حاضر رہتا تھا۔“

ایک پادری نے عرض کی۔

”ایک ہفتہ گزرا، میں نے اسے ہیکل عشروت کے آستانے پر بیٹھے دیکھا تھا، وہ اپنی جاوید اور غم زدہ نگاہوں سے دوق شفق کو دیکھ رہا تھا۔ گویا اس کا کوئی قصیدہ بادلوں سے گم ہو گیا ہے۔“

ایک درباری بولا

”کل میں نے اسے بید اور سرو کے درختوں میں بیٹھے دیکھا تھا۔ میں نے سلام کیا، لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا اور بدستور اپنے افکار و خیالات کے سمندر میں غرق رہا۔“

خواجہ سراؤں کے داروغہ نے کہا۔

"آج وہ مجھے محل کے باغیچہ میں نظر آیا تھا۔ میں اس کے قریب گیا تو دیکھا رنگت پیلی پڑ گئی ہے، چہرہ غم و ملال کی تصویر بنا ہوا ہے پلکوں پر آنسو مچل رہے ہیں اور سانس گھٹ گھٹ کر آ رہا ہے۔"

افسوسناک لہجہ میں بادشاہ نے حکم دیا۔

"جاؤ اسے فوراً تلاش کر کے لاؤ! مابدولت کی طبع مبارک اس کے لئے بے چین ہے۔"

غلام اور سپاہی شاعر کی تلاش میں چلے گئے اور بادشاہ سمیت سارا دربار خاموش، حیران اور منتظر بیٹھا رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ سب کمرہ کے وسط میں کھڑے ہوئے ایک غیر مرئی سائے کا وجود محسوس کر رہے ہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد خواجہ سراؤں کا داروغہ آیا اور بادشاہ کے قدموں پر گر پڑا اس پرندہ کی طرح جسے صیاد کے تیر نے گرا لیا ہو۔ بادشاہ بے اختیار چلایا۔

"کیا بات ہے؟ کیا ہوا"

"شاعر محل کے باغیچہ میں مردہ پڑا ہے۔"

بادشاہ ایک دم کھڑا ہو گیا، اس کا چہرہ رنج و غم سے مرجھا گیا، وہ آہستہ باغ کی طرف چلا، اس طرح کہ آگے آگے غلاموں کے ہاتھوں میں شمعیں تھیں اور پیچھے پیچھے درباری اور کاہن، باغ کا احاطہ کے پاس جہاں بادام اور انار کے درخت ہیں، شمعوں کی زرد شعاعوں کی روشنی میں ایک بے جان جسم دکھائی دیا جو گلاب کی سوکھی ہوئی ٹہنی کی طرح گھاس پر پڑا تھا۔

ایک درباری نے کہا

دیکھنا استاد کو کس طرح گلے لگا رکھا ہے، گویا وہ ایک حسین دوشیزہ ہے، جس سے اسے محبت تھی اور جو اس سے محبت کرتی تھی اور اسی محبت کی بنا پر انہوں نے عہد کر لیا

تھا کہ ہم دونوں ساتھ مریں گے۔

''حسب عادات اب بھی فضا کی گہرائیوں کو غور سے دیکھ رہا ہے۔ گویا ستاروں میں ایسے انجان خدا کی پرچھائیں نظر آ رہی ہے۔''

کاہن اعظم نے بادشاہ نے مخاطب ہوتے ہوئے عرض کی

''کل ہم اسے مقدس عشتروت کے ہیکل کے سائے میں دفن گے۔ شہر کا چھوٹا بڑا اس کی میت کے ساتھ ہوگا۔ نوجوان اس کے قصیدے گائیں گے اور نوخیز لڑکیاں اس کے تابوت پر پھول برسائیں گی چونکہ یہ ہمارے ملک کا سب سے بڑا شاعر تھا اس لئے اس کی تدفین کا جلوس بھی شاندار ہونا چاہیے۔''

بادشاہ نے شاعر کے چہرے سے نگاہیں ہٹائے بغیر جس پر موت کی نقاب پڑی تھی سر ہلایا اور آہستہ کہنے لگا۔

''نہیں جب یہ زندہ تھا اور ملک کے گوشہ گوشہ کو اپنی روح کی تاشیوں سے منور اور فضا کے ذرہ ذرہ کو اپنے سانس کی بیخریوں سے معطر کر رہا تھا ہم نے اسے فراموش کر دیا۔ اس لئے اگر ہم اب مرنے کے بعد اس کی عزت کریں گے تو دیوتا ہمارا مذاق اڑائیں گے اور وادیوں اور سبزہ زاروں کی پریاں ہم پر ہنسیں گی۔ بہتر یہی ہے کہ اسے یہیں دفن کرو جہاں اس کی روح اس کے جسم سے علیحدہ ہوئی ہے اس کے ستار کو اس کے جسم سے چمٹا رہنے دو۔ اگر تم میں سے اس کی عزت کرنی چاہتا ہے تو وہ گھر جائے اور اپنے اہل و عیال کو بتائے کہ بادشاہ نے اپنے شاعر سے بے اعتنائی برتی اور وہ تنہائی و غمگینی کے عالم میں مر گیا۔''

اس کے بعد اس نے چاروں طرف دیکھ کر پوچھا۔

''ہندی فیلسوف کہاں ہے؟''

فلسفی آگے بڑھا اور کہا

''جہاں پناہ! حاضر ہوں''

بادشاہ نے پوچھا

’’بتا اے حکیم! کیا دیوتا مجھے ایک بادشاہ اور اسے ایک شاعر کی حیثیت سے پھر اس دنیا میں بھیجیں گے؟ کیا میری روح کسی شہنشاہیت اقلیم کے ولی عہد اور اس کی روح ایک بڑے شاعر کا قالب اختیار کرے گی؟ کیا قانون فطرت اسے دوبارہ تجلیات الٰہی کی جلوہ گاہ میں حاضر کرے گا؟ تا کہ میں اس پر اپنے انعام واکرام کی بارش اور اس کے دل کو اپنی بخشش وعطا سے خوش کروں!‘‘

فلسفی نے جواب دیا

’’روح جو کچھ چاہتی ہے، اسے ملتا ہے، وہ ناموس جو موسم کے خاتمہ پر بہار کی عشرت فروشیوں کو لوٹاتا ہے ضرور آپ کو باجبروت شہنشاہ اور اسے شاعر اعظم بنا کر اس دنیا میں واپس بھیجے گا۔‘‘

بادشاہ کا چہرہ کھل اٹھا، اس کی روح میں ایک تازگی ایک شادابی کروٹیں لینے لگی۔ اور وہ اپنے محل کی طرف روانہ ہو گیا، اس کا دماغ ہندی فیلسوف کے اقوال پر غور کر رہا تھا اور اس کا دل ان الفاظ کو دہرا رہا تھا۔

’’روح جو کچھ چاہتی ہے اسے ملتا ہے۔‘‘

☆☆☆☆☆

قاہرہ۔۔۔مصر۔۔۔1912ء

چاند طلوع ہوا اور اپنی سیمیں چادر شہر پر ڈال دی۔ اس وقت وائی سلطنت اپنے محل کے دریچہ میں بیٹھا صاف ستھری فضا کو دیکھ رہا تھا۔ ان قوموں کے آغاز و انجام پر غور کر رہا تھا جو یکے بعد دیگرے نیل کے کنارے سے گزریں۔ ان بادشاہوں اور فاتحوں کے اعمال کا جائزہ لے رہا تھا جو ابولہول کے دبدبہ و جلال کے سامنے ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے اور اپنے تصور میں ان قبیلوں اور نسلوں کے جلوس عظمت کا تماشا دیکھ رہا تھا جنہیں زمانہ نے اہرام مصر کے اطراف سے نکال کر قصر عابدین میں پہنچایا۔

جب اس کے افکار کا دائرہ وسیع ہوا اور اس کے خیالات کی نزہت گاہوں میں کشیدگی پیدا ہو گئی تو وہ اپنے ندیم کی طرف متوجہ ہوا جو اس کے قریب بیٹھا تھا اور کہا۔

"آج کی رات ما بدولت کی خاطر شعر و سخن کی طرف مائل ہے۔ اس لئے کچھ سناؤ"

ندیم نے تعمیل حکم کے لئے سر جھکایا اور عہد جاہلیت کے کسی شاعر کا قصیدہ مترنم آواز میں پڑھنا شروع کیا۔

"کسی جدید شاعر کا کلام!" بادشاہ نے اسے روک دیا۔

ندیم نے دوبارہ سر جھکایا اور ایک مخصوص شاعر کا کلام سنانے لگا۔

"جدید ترین دور کا! بادشاہ نے پھر روکا۔ ندیم نے تیسرے بار پھر سر جھکایا اور موشح اندلسی کے اشعار پڑھنے لگا۔"

کسی ہم عصر شاعر کا قصیدہ سناؤ! بادشاہ نے حکم دیا

ندیم نے اپنی پیشانی پکڑی گویا شعرائے عصر کے تمام کارناموں کو اپنے حافظہ میں تازہ کر رہا ہے۔ یکایک اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ چہرہ پر خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی اور وہ زمانہ حاضر کے ایک بہت بڑے شاعر کے اشعار ترنم سے پڑھنے لگا۔ جن میں خیال کی گہرائی، آہنگ کا طلسم، معانی کی باریکی اور اچھوتا پن اور

وہ لطیف و نادر کنائے تھے جو ذہن میں سما کر اسے روشن کر دیتے ہیں اور دل کے گرد محیط ہو کر اسے شدت جذبات سے پگھلا دیتے ہیں۔

بادشاہ نے ندیم کو غور سے دیکھا۔ اشعار کی معنویت اور خوش آہنگی نے اسے بے قابو کر دیا تھا اور وہ ایک ایسے مخفی ہاتھ کا وجود محسوس کر رہا تھا جو اسے ایک اور ہی عالم دور دراز عالم کی طرف کھینچ رہے تھے۔ اس نے پوچھا۔

"یہ اشعار کس کے ہیں؟"

"بعلبکی شاعر دو عجیب و غریب کلمے تھے جو بادشاہ کے کانوں میں گونجے اور اس کے شفاف ذہن میں ان خواہشوں کی پرچھائیاں چھوڑ گئے جو اپنی وضاحت کی بنا پر مبہم اور اپنی باریکیوں کی بنا پر جان دار تھیں۔"

بعلبکی شاعر ایک نیا پرانا نام جس نے بادشاہ کے دماغ میں بھولے ہوئے دنوں کے نقوش تازہ کر دیئے اس کے سینے کی گہرائیوں میں سوئی ہوئی یاد کی پرچھائیوں کو نمایاں کر دیا اور ان خطوط میں جو بادلوں کے کناروں سے مشابہ تھے اس نوجوان کی تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے کھینچ دی، جو ستار کو اپنے گلے سے لگائے مردہ پڑا تھا اور اس کے چاروں طرف سپہ سالاران افواج پیشوایان مذاہب اور امرائے سلطنت کھڑے تھے۔

یہ منظر بادشاہ کی آنکھوں کے سامنے سے چھپ گیا جس طرح خواب طلوع سحر کے وقت روپوش ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اپنے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ کر ٹہلنے لگا۔ وہ بار بار پیغمبر اسلام کی یہ آیت دہرا رہا تھا۔

"تم مردہ تھے، اس نے تمہیں زندہ کیا اب وہ تمہیں مارے گا پھر جلائے گا اور تم آخر کار اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔"

اس کے بعد بادشاہ نے ندیم کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"ہمارے ملک میں بعلبکی شاعر کا وجود ہماری خوشی کا سبب ہوا ہم اس کے پاس جا

کر اس کی عزت افزائی کریں گے۔''

ایک منٹ کے بعد دھنسی ہوئی آواز میں اس نے پھر کہا۔

''شاعر ایک انوکھا پرندہ ہے، جو عالم قدس کے سبزہ زاروں سے اڑ کر چہچہاتا ہوا اس دنیا میں آتا ہے اس لئے اگر ہم نے اس کی عزت نہ کی تو وہ پر تولے گا اور پھر اپنے وطن چلا جائے گا۔''

رات گزر گئی فضا نے اپنا لباس اتار دیا جس میں ستارے ٹکے ہوئے تھے اور صبح کی شعاعوں سے بنی ہوئی قمیض پہن لی لیکن بادشاہ کا ذہن اب بھی ہستی کی نیرنگیوں اور زندگی کے اسرار و رموز میں سرگرداں تھا۔

☆☆☆☆☆☆

خودکشی سے پہلے

اس ویران و خاموش کمرہ میں، کل وہ عورت بیٹھی تھی، جسے میرا دل پیار کرتا ہے، ان گلابی اور نرم و نازک گاؤ تکیوں پر اس کا سر رکھا تھا اور اس لوریں شیشہ اس نے عطر آمیز شراب کا ایک قطرہ پیا تھا۔

یہ جو کچھ تھا، کل تھا اور ’’کل‘‘ ایک خواب ہے جو اب کبھی واپس نہیں آ سکتا۔ لیکن آج وہ عورت جو میری امیدوں کی دنیا ہے۔ ایک دوسری ویران اور دور دراز سر زمین کی طرف چلی گئی ہے۔ جسے تنہائی و فراموشی کا ملک کہتے ہیں۔

اس عورت کی انگلیوں کے نشانات، جو میرے دل کی ملکہ ہے، اب تک میرے آئینہ پر نمایاں ہیں، اس کے سانس کی خوشبو سے اب تک میرے کپڑے مہک رہے ہیں اور اس کی شیریں آواز سے اب تک میرے مکان کا گوشہ گوشہ گونج رہا ہے لیکن خود وہ عورت وہ عورت جو میرے جذبات محبت کا مرکز ہے۔ ایک دور دراز مقام کی طرف روانہ ہو گئی ہے جسے ہجر و فراق کی بستی کہتے ہیں مگر اس کی انگلیوں کے نشانات اس کے دہن کا معطر اور اس کی روح کی پرچھائیاں اس کمرہ میں کل صبح تک باقی رہیں گی اور جب ہوا کے لئے میں اپنے مکان کے دروازے کھولوں گا تو اس کے جھونکے ہر اس چیز کو اڑا لے جائیں گے جو اس حسین ساحرہ نے میرے لئے چھوڑی ہے!

اس عورت کی تصویر جو میری تمناؤں کا سر چشمہ ہے اب تک میرے بستر کے قریب لٹک رہی ہے محبت کے وہ خطوط، جو اس نے مجھے لکھے تھے، اب تک عقیق و مرجان سے مرصع، چاندی کی صندوقچی میں محفوظ ہیں اور اس کی پیشانی کے سنہری بال جو اس نے اپنی نشانی کے طور پر مجھے دیئے تھے۔ اب تک مشک وغیرہ سے بسے ہوئے غلاف میں رکھے ہیں یہ تمام چیزیں صبح تک اپنی جگہ رہیں گی لیکن جب صبح ہو گی اور ہوا کے لئے میں اپنے دروازے کھولوں گا تو اس کی موجیں ان سب چیزوں کو

عدم کی تاریکیوں میں لے جائیں گی، جہاں سکون و خاموشی کا دور دورہ ہے۔

نوجوانو! وہ عورت جس سے میں محبت کرتا ہوں، انہیں عورتوں جیسی ہے جن سے تم محبت کرتے ہو، یہ ایک عجیب مخلوق ہے جسے دیوتاؤں نے کبوتر کی صلح پسندی، سانپ کے پیچ و غم، طاؤس کے غرور ناز، بھیڑیئے کی کج خلقی، سفید گلاب کے پھول کی رعنائی، اور اندھیری راتوں کے خوف کی مٹھی بھر راکھ اور چلو بھر سمندر جھاگ میں ملا کر بنایا ہے۔

میں اس عورت کو جس سے مجھے محبت ہے، بچپن سے جانتا ہوں، جبکہ میں کھیتوں میں اس کے پیچھے پیچھے دوڑتا تھا اور بازاروں میں اس کا دامن پکڑ لیتا تھا۔

میں اسے اپنے عہد نوجوانی میں بھی جانتا تھا جبکہ میں کتابوں میں اس چہرے کا عکس دیکھتا تھا شام کے بادلوں میں اس کے قامت کا مشاہدہ کرتا تھا اور نہروں کی روانی میں اس کی آواز کا ترنم سنتا تھا۔

میں اسے اپنی پختہ عمری کے دور میں بھی جانتا تھا جبکہ میں اس کے پہلو میں بیٹھ کر اس سے گفتگو کرتا تھا، مختلف چیزوں کے متعلق سوال کرتا تھا، اپنے دل کی درد کی شکایتیں لے کر اس کے پاس جاتا تھا اور اپنی روح کے اسرار اس پر ظاہر کرتا تھا۔

یہ جو کچھ تھا کل تھا اور ''کل'' ایک خواب کبھی واپس نہیں آ سکتا۔

لیکن آج وہ عورت، جسے میرا دل پیار کرتا ہے ایک سرد ویران اور دور دراز سر زمین کی طرف چلی گئی ہے جسے تنہائی و فراموشی کا ملک کہتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

لیکن اس عورت کا نام کیا ہے؟ جسے میرا دل پیار کرتا ہے؟ اس کا نام زندگی ہے۔

زندگی ایک حسین و سحرکار عورت ہے جو ہمارے دلوں کو لبھاتی ہے۔ ہماری روحوں کو ورغلاتی ہے اور ہمارے ادراک و احساس کو اپنے وعدوں سے گراں بار کرتی ہے۔ یہ وعدے اگر طول کھینچتے ہیں تو ہم میں سے صبر کی قوت جاتی رہتی ہے اور اگر

پورے ہو جاتے ہیں تو ہمارے باطن میں رنج و الم کے شعلے بھڑک اٹھتے ہیں۔

زندگی ایک عورت ہے جو ان سفید دنوں کا لباس پہنتی ہے جن میں سیاہ راتوں کے استر لگے ہوئے ہیں۔

زندگی ایک عورت ہے جو قلب انسانی کو اپنا دوست تو بنا سکتی ہے لیکن شوہر نہیں بنا سکتی۔

زندگی ایک بدکار مگر حسین عورت ہے جو کوئی اس کی بدکاری دیکھ لیتا ہے اس کے حسن سے نفرت کرنے لگتا ہے۔

☆☆☆☆☆

غلامی

انسان زندگی کا غلام ہے اور یہ غلامی اس کے دنوں کو ذلت و خواری کے پردہ میں لپیٹ دیتی اور اس کی راتوں کو اشک و خوں کے سیلاب میں غرق کر دیتی ہے۔

میری پیدائش اولیں کو ساٹھ ہزار برس ہوئے، لیکن آج تک میں نے تسلیم پیشہ غلاموں اور طوق و سلاسل میں جکڑے ہوئے قیدیوں کے سوا کسی کو نہیں دیکھا۔

میں دنیا کے مشرق و مغرب کا سفر کیا، زندگی کی تاریکی اور روشنی کے گرد چکر لگائے، قوموں اور نسلوں کو، گروہ در گروہ غاروں سے نکل کر محلوں میں جاتے دیکھا لیکن ہنوز بوجھ سے دبی ہوئی گردنوں، زنجیروں میں جکڑی ہوئی کلائیوں اور بتوں کے سامنے جھکے ہوئے گھٹنوں کے سوا اور مجھے کچھ نظر نہ آیا۔

بابل سے پیرس اور نینوا سے نیو یارک تک میں انسان کے ساتھ ساتھ رہا، میں نے اس کے نقوش قدم کے برابر اس کی بیڑیوں کے نشانات، ریگ زار پر مرتسم دیکھے اور وادیوں اور جنگلوں کو زمانہ اور قوموں کے نالہ و ماتم کی صدائیں دہراتے سنا۔

میں شاہی محلوں، مدرسوں اور عبادت گاہوں میں گیا۔ قربان گاہوں اور معبدوں کے سامنے کھڑا ہوا دیکھا۔ مزدور تاجر کا غلام ہے۔ اور تاجر سپاہی کا، سپاہی سپہ سالار کا غلام ہے اور سپہ سالار بادشاہ کا بادشاہ کاہن کا غلام ہے اور کاہن صنم اور صنم مٹی ہے جسے گوندھ کر شیطانوں نے مردہ کھوپڑیوں کے ڈھیر پر نصب کر دیا ہے۔

میں امیروں اور طاقت وروں کی حویلیوں میں داخل ہوا، غریبوں اور کمزوریوں کی جھونپڑیوں میں گیا۔ ہاتھی دانت کی تصویریں اور طلائی ساز و سامان سے سجے ہوئے کمروں میں بیٹھا یاس و نومیدی کی پرچھائیوں اور موت کے سانسوں میں مکدر کوٹھریوں میں ٹھہرا اور دیکھا بچے دودھ کے ساتھ غلامی کا زہر پی رہے ہیں۔ لڑکے ا ب ت کے ساتھ انکسار اور خاکساری کا سبق سیکھ رہے ہیں۔ لڑکیاں عاجزی اور دغا بازی کے راستہ لگے ہوئے لباس پہن رہی ہیں اور عورتیں اطاعت و فرمانبرداری

کے بستروں میں سو رہی ہیں۔

میں قوموں کے ساتھ ساتھ گنج کے کناروں سے فرات کے ساحل نیل کے دہانہ، سینا کے پہاڑ، ایتھنز کے میدانوں، روم کے کلیساؤں، قسطنطنیہ کی گلیوں، پیرس کی سیرگاہوں اور لندن کی عالی شان عمارتوں تک گیا اور دیکھا ہر جگہ غلامی عظمت و جلال کے جلوس کے ساتھ ہے۔ لوگ اس کی قربان گاہوں پر، نوجوان لڑکوں اور کنواری لڑکیوں کو بھینٹ چڑھاتے ہیں اور اسے ''دیوتا'' کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس کے قدموں میں عطر و شراب بہاتے ہیں اور اسے ''بادشاہ'' کا لقب دیتے ہیں اس کی مورتیوں کے سامنے عود و لوبان سلگاتے ہیں اور اسے پیغمبر کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ سجدہ کرتے ہیں اس کے سامنے گرتے ہیں اور اسے ''قانون'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کے لئے لڑتے ہیں اور ایک دوسرے کو قتل کرتے ہیں اور اس کا نام ''وطنیت'' رکھتے ہیں۔ خود کو اس کی مرضی کے سپرد کردیتے ہیں اور اسے زمین پر ''خدا کا سایہ'' سمجھتے ہیں۔ اس کی ارادت و عقیدت کے جوش میں اپنے مکانوں کو آگ لگاتے اور عمارتوں کو ڈھاتے ہیں اور اسے ''بھائی'' اور ''مساوات'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس کی راہ میں جان توڑ کر کوشش کرتے ہیں اور اسے مال و تجارت کہتے ہیں۔

بالفاظ دیگر وہ ایک حقیقت ہے اور ایک جوہر جس کے متعدد نام ہیں اور مختلف مظاہر کی بلکہ وہ ایک ازلی اور ابدی روگ ہے جس کے جلوس میں مختلف قسم کی بیماریاں اور جراحتیں ہوتی ہیں جنہیں اولاد روح حیات کی طرح اپنے آباؤ اجداد سے ورثہ میں پاتی ہے اور جن کے بیج ایک زمانہ دوسرے زمانہ کی مٹی میں ڈالتا ہے جس طرح ایک فصل کے بیج دوسری فصل میں بوئے جاتے ہیں۔

غلامی کی جتنی قسمیں اور صورتیں میں نے دیکھی ہیں بہت عجیب ہیں۔

اندھی غلامی جو انسان کے حال کو اس کے اسلاف کے ماضی سے جکڑ دیتی ہے اور

اس کے نفس کو ان کی رواجی پابندیوں کا اسیر کر کے، اسے پرانی روحوں کے لئے ایک نیا جسم اور بوسیدہ ہڈیوں کے لئے ایک قلعی شدہ قبر بنا دیتی ہے۔

گونگی غلامی جو مرد کی زندگی کو اس عورت کے دامن سے باندھ دیتی ہے، جس سے وہ نفرت کرتا ہے اور عورت کے جسم کو اس شوہر کے بستر سے وابستہ کر دیتی ہے۔ جس سے وہ بیزار ہوتی ہے اور اس طرح ان دونوں کو زندگی کے ایک رشتہ میں پرو دیتی ہے جو پاؤں اور جوتی کے رشتہ سے مشابہ ہوتا ہے۔

بہری غلامی جو افراد کو گردو پیش کے رجحانات کی تقلید ان کے رنگ میں رنگ کی سیادت کا جوا رکھ دیتی اور اہل ہمت کے ارادوں کو عظمت و شہرت کے لالچیوں کی خواہشوں کے حوالے کر دیتی ہے جس کی بنا پر وہ ان آلات کی مثال ہو جاتے ہیں انگلیاں پہلے حرکت دیتی ہیں پھر ٹھہرا کر توڑ ڈالتی ہیں۔

ادھیڑ غلامی جو بچوں کی روحوں کو وسیع فضا سے سیاہ بختی کے ان مسکنوں میں پھینک دیتی ہے جہاں ضرورت جہالت کے ہم پہلو مقیم ہوتی ہے اور ذلت مایوسی کے جوار میں اور یہ بچے بدنصیبی کے سایہ میں جوان ہوتے، مجرموں کی طرح زندگی بسر کرتے اور ذلت کے ساتھ مر جاتے ہیں۔

رنگ برنگی غلامی جو اشیاء کو ان کی واقعی قیمت ادا کئے بغیر خریدتی اور انہیں ان ناموں سے پکارتی ہے جو ان کے اصلی ناموں سے مختلف بلکہ ان کی ضد ہیں چنانچہ وہ مکاری کو عقل مندی بکواس کو معرفت، کمزوری کو نرم دلی اور بزدلی کو انکار و بے نیازی سے تعبیر کرتی ہے۔

خمیدہ غلامی جو کمزوروں کی زبان کو خوف و دہشت کے زیر اثر جنبش دیتی ہیں چنانچہ وہ ایسی باتیں کہتے ہیں جنہیں وہ نہیں سمجھتے ان چیزوں کا اظہار کرتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہوتیں اور بیچارگی کے ہاتھوں میں کپڑے کے اس تھان کی مثال ہو جاتے ہیں جسے جب چاہو لپیٹ لو اور جب چاہو کھول دو۔

کبڑی غلامی جو ایک قوم کو دوسری قوم کے قوانین کی طرف لے جاتی ہے۔

متعدی غلامی جو شہزادوں کے سر پر حکومت کا تاج رکھتی ہے۔

سیاہ غلامی جو بے خطا مجرموں کی اولاد کو ذلت اور حقارت کے ناموں سے پکارتی ہے۔

اور خود غلامی نتیجہ ہے، اس غلامی کا جسے ''قوت استمرار'' کہتے ہیں۔

جب میں قوموں کی ہمراہی سے تھک گیا اور میری نگاہ نسلوں اور قبیلوں کو دیکھتے دیکھتے اکتا گئی تو پرچھائیوں کی وادی میں تنہا جا بیٹھا جہاں گزرے ہوئے زمانہ کے سائے روپوش اور آنے والے زمانے کی روحیں گھات میں بیٹھی تھیں وہاں میں نے دیکھا ایک نازک سایہ، سورج پر نگاہیں جمائے، تنہا چلا جا رہا ہے میں نے اس سے پوچھا۔

''تو کون ہے؟ اور تیرا نام کیا ہے؟''

جواب دیا

''آزادی!''

میں نے پھر سوال کیا

''اور تیرے بیٹے کہاں ہیں؟''

''ایک سولی پر چڑھا دیا گیا اور دوسرا دیوانہ ہو کر مر گیا اور تیسرا ابھی پیدا نہیں ہوا''

یہ کہا اور کہہ کر پیچھے میری نگاہوں سے روپوش ہو گیا۔

☆☆☆☆☆

میں کس سے محبت کرتا ہوں

میں انتہا پسندوں سے محبت کرتا ہوں۔

ان لوگوں سے محبت کرتا ہوں جو زندگی کے سمندر کی گہرائیوں میں اترتے اور زندگی کی بلندیوں پر چڑھنے کی قدرت رکھتے ہیں۔

ان لوگوں سے محبت کرتا ہوں، جو قوی اور مستحکم ارادوں سے بھرپور ہیں اور ان بسیط روحوں کی تمنا کرتا ہوں جو ”ترکیب“ کو بالطبع قبول نہیں کرتیں اور ”تقسیم“ جن کے جوہر کے پاس تک نہیں پھٹک سکتی۔

میں ان دلیر انتہا پسندوں سے محبت کرتا ہوں جو اپنے شوق و آرزو کی آگ میں جلتے ہیں، اپنے دلوں کے وجدان سے بے چین ہیں۔ اپنے جذبات کی اطاعت کرتے ہیں، اصولوں کے میدان کارزار سے ہٹ کر ”اصل اصول“ کو اپنا مرکز قرار دیتے ہیں، اختلاط و افکار سے روگرداں ہو کر اپنا رخ اس مجرد اور اولین کی فکری کی طرف کر لیتے ہیں جو انہیں بادلوں سے پرے بھی اڑا لے جاتی ہے اور سمندر کی گہرائیوں میں بھی اتار دیتی ہے۔

میں اعتدال پسندوں کو جانتا ہوں، میں ان کے ارادوں کو تولا ہے ان کی کوششوں کو جانچا ہے اور انہیں بزدل پایا ہے جو بادشاہ کی شکل میں ”حق“ سے اور شیطان کی صورت میں ”باطل“ سے ڈرتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے عقائد و قواعد کے ان درمیانی حلقوں میں پناہ لے لی ہے جو نہ مفید ہیں، نہ مضر اور ان آسان راہوں پر چلنے لگے ہیں جو انہیں سنسان جنگلوں میں لے جاتی ہیں ان سنسان جنگلوں میں جو ہدایتوں اور گمراہیوں سے خالی ہیں جہاں کامیابیوں اور ناکامیوں اور ناکامیابیوں کا کال۔

زندگی موسم گرما ہے۔ جس کی تمناؤں اور آرزوؤں کے سمندر مترنم ہوتے ہیں، اور موسم سرما ہے، جو اپنی آندھیوں کے ہلاکت خیزیوں کے سبب تاپناک ہے اس

لئے جوکوئی اپنی زندگی کو گرمیوں کے خار اور جاڑوں کی دہشت سے محفوظ رکھنے کے لئے اسے مختلف حصوں میں تقسیم کرنے میں اعتدال سے کام لیتا ہے، اس کے دن جلال و جمال سے خالی اور اس کی راتیں افسانہ و خواب سے محروم ہو جاتی ہیں اور وہ خود زندوں کے مقابلہ میں ہو جاتا ہے جو زمین کے بطن میں سونے کے لئے مرتے ہیں۔ نہ سوچ کی روشنی میں چلنے پھرنے کے لئے تندرست ہوتے ہیں۔

جوکوئی دین میں اعتدال سے کام لیتا ہے، وہ سزا کے خوف اور جزا کی خواہش کے درمیان حیرانی و سرگشتگی کے عالم میں کھڑا رہتا ہے۔ چنانچہ جب کبھی اہل ایمان کے جلوس کے ساتھ چلتا ہے، لکڑی کے سہارے چلتا ہے اور جب کبھی بحالت نماز رکوع میں جاتا ہے تو اس کی فکر اس کے سامنے کھڑی ہو کر اس کا مذاق اڑاتی ہے۔

اور جوکوئی دنیا میں اعتدال سے کام لیتا ہے وہ مدت العمر وہیں رہتا ہے جہاں پیدا ہوا تھا، وہ نہ پیچھے ہٹتا ہے کہ لوگ اس کی رجعت سے سبق حاصل کریں نہ آگے قدم بڑھاتا ہے کہ دنیا کو راہ راست دکھائے یا اپنے کارناموں سے اس کی تربیت کرے بلکہ حیران اور بے حس و حرکت کھڑا رہتا ہے اپنے سائے پر نگاہیں جمائے، اپنے دل کی دھڑکنوں پر کان لگائے اور اپنے انفاس کا گلا گھونٹے۔

اور جوکوئی محبت میں اعتدال سے کام لیتا ہے وہ اس کے شفاف پیالوں سے سرد و شیریں شربت پیتا ہے نہ گرم و تلخ شراب بلکہ اس کے ہونٹ اس کنکنے پانی کے قطروں سے تر رہتے ہیں جنہیں جہالت کمزوری اور خوف کے جوہڑوں سے پیتی ہے۔

اور جوکوئی شر کی مدافعت اور خیر کی اعانت میں اعتدال سے کام لیتا ہے۔ وہ شر کو شکست دے سکتا ہے، نہ خیر کی امداد کر سکتا ہے وہ صرف اسی پر اکتفا کرتا ہے کہ پگھلے ہوئے جذبات کے اردگرد منجمد جذبات کی دیوار کھینچ لے چنانچہ وہ اپنی ساری عمر خواہشوں کے ساحل پر بسر کر دیتا ہے۔ سیپ کی طرح اس کا طاہر، پتھر کی مانند سخت

اور باطن، غلیظ رطوبتوں سے پر ہوتا ہے وہ نہیں جانتا کہ زندگی کے سمندر کا چڑھاؤ کب ختم اور اتار کب شروع ہوگا؟

اور جو کوئی عظمتوں کی طلب میں اعتدال سے کام لیتا ہے، ان تک کبھی نہیں پہنچ سکتا۔ وہ عظمت و بزرگی کی روح کے نکھار کی طرف دھیان نہیں دیتا بلکہ ان کی ظاہری سطح پر سونے کا چمک دار پانی چڑھا دیتا ہے جو کبھی خشک نہیں ہوتا، یہاں تک کہ ہوا کا ایک جھونکا یا روشنی کی ایک شعاع اسے فنا کر دیتی ہے۔

اور جو کوئی آزادی کے پیچھے دوڑنے میں اعتدال سے کام لیتا ہے وہ ٹیلوں اور دیواروں میں اس کے نقوش قدم کے سوا اور کچھ نہیں دیکھ سکتا اس لئے کہ آزادی زندگی کی مانند ہے جو لنگڑوں اور پاؤں توڑ کر بیٹھ جانے والوں کے لئے اپنی رفتار سست نہیں کرتی۔

اور جو کوئی خواہشوں میں اعتدال سے کام لیتا ہے وہ بلند و طویل یا نظر فریب کوتاہ زندگی کا طالب ہوتا ہے لیکن اس کے ارادہ کے خلاف اسے طویل و بے رنگ یا کوتاہ و بے کیف زندگی نصیب ہوتی ہے اور اگر وہ انتہا پسندوں میں سے ہوتا تو کامیابی و کامرانی کا دامن اس کی زندگی کے ہاتھ میں ہوتا اور وہ حق، محبت اور آزادی سے ہمکنار ہوتی۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

میں نے درماندہ اعتدال پسندوں کو کہتے سنا
“قناعت وہ خزانہ ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا!”

تو میری روح نے ایک بیزاری سی محسوس کی اور یہ کہہ کر ان سے دور ہوگئی۔

بندر انسان اور بالشتے دیو کس طرح بن سکتے ہیں جبکہ وہ اپنی پستی و کم قدری پر قانع ہیں اور میں نے بندروں اور بالشتیوں کو کہتے سنا
“اعتدال فضیلتوں کا سر ہے!”

تو میری روح گھبرا گئی اور یہ کہہ کر اس نے اپنا منہ ان کی طرف سے پھیر لیا۔

”کیا یہ مخلوق اشیاء کی حقیقت کا ادراک کر سکتی ہے جبکہ وہ ان کے درمیانی نقطوں پر نگاہیں جمائے ہوئے ہے؟ کیا حیوانات کی طرح اشیاء کا بھی سر اور دم نہیں ہوتی؟“

تو میری روح مضطرب ہو گئی اور غصہ سے کہنے لگی۔

”یہ کاہل آدھی چڑیا پانے کے بھی مستحق نہیں ہیں، جب تک دس چڑیوں کے پیچھے دوڑنے کے لئے اپنی ٹانگوں کو زحمت نہ دیں۔ کیا اڑتے ہوئے پرندوں کے جھنڈ کے پیچھے دوڑنا زندگی کی راہ میں جدوجہد نہیں ہے۔ بلکہ زندگی کا مقصد نہیں ہے بلکہ خود زندگی نہیں ہے!“

☆☆☆☆☆

میں انتہا پسندوں سے محبت کرتا ہوں۔

میں اس سے محبت کرتا ہوں، جسے اعتدال پرستوں نے سولی پر چڑھایا اور جب اس کا منکا ڈھل گیا اور اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں تو ایک دوسرے سے کہنے لگے۔

”آج ہم نے اس آزار رساں انتہا پسند سے چھٹکارا پا لیا!“

لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ اس کی روح اسی لمحہ نسلوں اور قوموں کو مطلوب کرتی ہوئی چلی گئی۔

میں اس سے محبت کرتا ہوں جس نے اپنے باپ کی شان و شوکت پر لات ماری اور ریشمی لباس کے بدلے گدڑی اور رفعت کے بدلے ذلت قبول کر کے، اس مرکزی طرف تنہا روانہ ہو گیا۔ جو الہام و وحی کا سرچشمہ ہے، اعتدال پرست اس کا مذاق اڑاتے اور اس کے اس فعل پر حیرت کا اظہار کرتے رہے لیکن اس کی نازک اور باریک انگلیاں وجود کے ظاہر و مخفی پہلوؤں کو جمع کرتی رہیں۔

میں ان شہیدوں سے محبت کرتا ہوں جو موت کی آرزوئیں کرتے ہیں، انتہائی مقصد کے سوا ہر چیز کو ارزاں خیال رکھتے ہیں اور ”بلند غرض“ کے سوا ہر شے کو حقیر سمجھتے ہیں۔

میں ان لوگوں سے محبت کرتا ہوں جو آگ میں جلائے گئے، سنگ سار کئے گئے پھانسی پر لٹکائے گئے تلوار کے گھاٹ اتارے اس ”فکر“ کی بناء پر جس نے ان کی عقلوں کو اپنا لیا تھا یا اس جذبہ کی بنا پر، جس نے ان کے دلوں کو بھڑکا دیا تھا۔

میں انتہا پسندوں سے محبت کرتا ہوں، چنانچہ جب کبھی میں نے پیالہ اپنے ہونٹوں سے لگایا ان کے آنسو اور خوف کا مزہ چکھا جب کبھی اپنی کھڑکی میں سے فضا کی طرف نگاہ کی ان کے تاب ناک چہرے دیکھے۔ اور جب کبھی آندھی پر کان لگائے ان کی خوشی کے ترانے اور مسرتوں کے گیت سنے!

☆☆☆☆☆

فن

اپنے فن! جو اپنی تاثیر کی بنا پر عظیم، اپنے کارناموں کے بنا پر عجیب اور اپنے جمال واسرار کی بنا پر بلند ہے! تو ایجاد پسند فنکاروں کے ذہن میں ازلی موجود کے کمالات قدرت کی ایک پرچھائیں ہے، ابدیت اور قلب انسانی کے درمیان منڈلائی ہوئی روح خداوندی ہے تو اس عالم میں جو اپنی حرکت کی بنا پر خوابیدہ اور اپنی رفتار کی بنا پر جامد ہے، ایک بیدار فکر ہے، اپنی ننھی انگلیوں سے تو عناصر کو جمع کرتی اور ان سے ایسی ایسی تصویریں اور پرچھائیاں بناتی ہے، ایسے ایسے اجسام اور نغمے پیدا کرتی ہے جو زمانہ کے ساتھ باقی رہتے ہیں جن کا حسن ابدالآباد تک زائل نہیں ہوتا۔

"عدم جب تیرے دامن کو مس کرتا ہے تو "شے" کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اور موت جب تیرے سامنے کھڑی ہوتی ہے تو زندگی سے بدل جاتی ہے، تمام آوازیں رنگ اور خطوط، تمام عناصر، ارواح اور سائے اور ہر وہ چیز جسے فطرت اپنی حرکت اور انسان اپنے وجود سے پیدا کرتا ہے تیری مرضی کے آگے سپر انداز ہیں، تیرے وجود سے وجود پذیر ہوتے ہیں اور تیری خواہش کے مطابق جنبش میں آتے ہیں۔"

تو زمانہ کو مس کرتا ہے اور زمانہ پتھر کی شکل اختیار کر کے ان مورتیوں میں تبدیل ہو جاتا ہے جو ابدیت کے مقابل کھڑی ہیں تو ہوا میں سانس لیتا ہے اور تیرے نغمہ کار ہونٹوں اور آہنگ آفریں انگلیوں سے ایک آسمانی شراب ہوا میں بکھر جاتی ہے تو ذرات نور میں مرتعش ہوتا ہے اور کتابوں کے صفحات پر اپنی سیاہی کے ساتھ روشنی جگمگانے لگتی ہے تو شفق کی شعاعوں اور قوس قزح کے رنگوں کو جمع کرتا ہے اور ان سے عجیب عجیب تصویریں اور نقش و نگار بناتا ہے تو چٹانوں کو اپنے قدموں سے پامال کرتا ہے اور چٹانیں ان مندروں، مسجدوں اور ہیکلوں کی صورت میں بلند مرتبہ ہو جاتی ہیں جن کی بقاء مذہب کی بقاء سے وابستہ ہے۔

تیرے تخت کے سامنے قومیں بیدار اور مترنم کھڑی رہتی ہیں چنانچہ ان میں سے جو گزر چکی ہیں وہ تیری موجودگی کے سبب موجود ہیں اور جو آنے والی ہیں وہ اس وقت بھی تیرے دامن کے گرد طواف کر رہی ہیں۔

قوموں کی عظمت، اسی وقت تک باقی رہتی ہے جب تک تو باقی رہے اور اسی وقت زائل ہو جاتی ہے جب تو زائل ہو جائے۔ اس لئے کہ قوموں کی زندگی میں تیرا وہی درجہ ہے جو درجہ جسم میں دل کا ہے چنانچہ مصر، آشور اور ایران، آسمان کی بلندیوں تک نہیں پہنچے جب تک تو ان کے قریب نہ ہوا اور ذلت و پستی کے غار میں نہیں گرے جب تک تو نے ان سے دوری اختیار نہ کی۔ افریقہ، روم اور قسطنطنیہ روشنی سے ہمکنار نہیں ہوئے جب تک تیرے سائے میں نہ آ گئے اور تاریکی کے لحافوں میں نہیں سوئے جب تک تو نے انہیں نہ چھوڑا۔

اور آج جب زمانہ نے ان قوموں کی عظمت و جبروت کو مٹا دیا ہے ناممکن ہے کہ ان کے آثار سے تیرے نقوش قدم کو محو کر دے اس طلسمی نقاب کے بچے کھچے ٹکڑوں کو چاک کر دے جو تو نے ان قدموں کے باقی رہنے والے کارناموں پر ڈالی تھی چنانچہ نیل کے ساحل پر چلنے والا محلوں اور ہیکلوں میں تیری پرچھائیوں کو منڈلاتے دیکھتا ہے اور ابلیس پر بیٹھنے والا تیرے سانس کے شعلوں کو ستونوں اور موتیوں پر کاوے کاٹتے دیکھتا ہے اور اسپارٹا تدمر اور بعلبک کے کھنڈروں کی دیواروں کو دیکھنے والا ان نظموں کے مطالعے اور قصیدوں کے مقطعے پڑھتا ہے جو تیری انگلیوں نے رقم کئے تھے۔

اگر تاریخ زمانہ کا آئینہ ہے تو وہ ہاتھ ہے جس نے اس آئینہ کی سطح کو صیقل کے ذریعے مجلا کیا اگر علم وہ زینہ ہے جو انسانوں کو ستاروں سے آگے جانے والے جہانوں میں پہنچاتا ہے تو وہ عزم ہے جس نے اس زینہ کی سیڑھیاں بنائیں اور ان کی حفاظت کی اور اگر مذہب ''شعر حیات'' ہے تو وہ وزن ہے جس نے اس شعر کو

سینوں کے لئے ایک آہنگ اور رولوں کے لئے ایک نغمہ بنایا۔

اے فن جو اپنے اسرار کی بنا پر انوکھا اپنے رموز کی بنا پر عجیب وغریب اپنی رقب کی بنا پر قوی اور اپنی غیر معمولی عظمت وجلالت کی بنا پر دلکش ونظر فریب ہے۔ ہم تیرا وصف کس طرح بیان کریں اور کس چیز سے تجھے تشبیہ دیں؟ جب کہ تو خودی وصف کی روح اور تشبیہ کی علت ہے! کیا ہم تجھے جذبہ کے نام سے تعبیر کریں جب کہ تو خود احساس وجذبات کا سرچشمہ ہے! یا قوت کے نام سے پکاریں؟ جب کہ تو خود قوتوں اور ارادوں کا مظہر ہے۔ ہم تیری بزرگی کو دل کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ تیرے ترانوں کو اپنے نفس کے کانوں سے سنتے ہیں اور تیرے دامن کو اپنی روح کے مرتعش ہونٹوں سے چومتے ہیں لیکن ہم تیرے نام کے حرفوں میں سے ایک حرف بھی نہیں لکھ سکتے جب تک ہماری انگلیاں تیری انگلیوں سے مس نہ کریں اور تیرے جمال کے متعلق ایک لفظ نہیں کہہ سکتے جب تک ہماری زبانیں تیرے حسن کی شراب میں ڈوب نہ جائیں تو اپنا مظہر آپ ہے اور ہم اس محبت کی قوت کے ذریعہ جو تو نے ہماری گہرائیوں میں پیدا کی ہے اس قوت کی محبت سے قریب ہوتے ہیں جو اللہ نے تیری گہرائیوں میں پیدا کی ہے۔

اے فن! مجھے اپنے ان خادموں میں ایک خادم بنالے جو زندگی پر اپنا اقتدار رکھتے ہیں اپنے ان سپاہیوں میں ایک کا سپاہی بنالے جو زمانہ پر غالب ہیں۔ میری آزادی کو اپنی مشیت کی پرستش کرنے دے اور میری روح کو اپنی شعاع سے مس کر! بہت ممکن ہے کہ اس طرح وہ خود سے اور تجھ سے قریب ہو جائے۔

☆☆☆☆☆

پس پردہ

جب رات آدھی ہوئی تو راحیل نے آنکھیں کھولیں، تھوڑی دیر تک چھت کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھا، اور بند کر لیں۔ پھر ایک گہرا مگر ٹوٹتا ہوا ٹھنڈا سانس بھرا اور ایسی آواز میں سے موت کا شدید کرب ظاہر ہوتا تھا، کہا

''جلوس سحر وادی کے کناروں تک پہنچ گیا ہے ہمیں اسے دیکھنے جانا چاہئے!''

یہ سن کر پادری اس کے قریب آیا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا مردہ کا ہاتھ برف کی طرح ٹھنڈا تھا اور اس کے بعد اس نے اپنا ہاتھ اس کے سینے پر رکھا مردہ کے دل کی حرکت زمانہ کی طرح خاموش تھی۔

پادری نے اپنا سر جھکایا اور اس کے ہونٹ مرتعش ہوئے گویا اپنی زبان سے ایک مقدس کلمہ ادا کرنا چاہتا تھا، جسے رات کے سائے پر امن سنسان وادیوں میں دہرائیں۔

اب اس نے اپنی دونوں کلائیوں سے سینہ پر صلیب بنائی اور اس شخص کی طرف متوجہ ہو کر جو اسی کمرہ کے ایک تاریک گوشہ میں بیٹھا تھا، شفقت و مہربانی کے لہجہ میں کہنے لگا

''افسوس تمہاری بیوی اللہ کو پیاری ہوئی اٹھو! اور میرے ساتھ اس کی بخشش کے لئے دعا مانگو۔''

اس شخص نے اپنا سر اٹھایا، اس کا چہرہ وفور ملال سے متغیر ہو گیا تھا اور آنکھیں شدت الم سے نکل پڑ رہی تھی، وہ خاموشی سے اٹھا اور پادری کے پہلو میں بیٹھ کر مرنے والی کے لئے دعائے مغفرت کرنے لگا، اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور وہ بار بار اپنے سینے اور چہرے پر صلیب کا نشان بنا رہا تھا۔

پادری اٹھا اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا۔

''اب تم دوسرے کمرے میں جاؤ! تمہیں نیند اور آرام کی سخت ضرورت ہے!''

وہ بغیر کچھ کہے سنے اٹھا اور سامنے والے کمرہ میں جا کر ایک چھوٹے سے صوفے پر گر گیا۔ غم، بیداری اور انتظار نے اس کو بے جان کر دیا۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ نیند اس کی آنکھوں پر غالب آ گئی اور وہ سو گیا جس طرح ایک شیر خوار بچہ اپنی ماں کی آغوش میں سوتا ہے۔

لیکن پادری ابھی تک اسی کمرہ کے وسط میں رنج و ملال کی تصویر بنا کھڑا تھا۔ وہ بیک وقت اشک آلود آنکھوں سے راحیل کی لاش کو بھی دیکھ رہا تھا اور اس کے شوہر کو بھی، جو سامنے والے کمرہ میں غافل پڑا سو رہا تھا۔

ایک گھنٹہ گزر گیا، جو زمانہ سے زیادہ طویل اور موت سے زیادہ ہولناک تھا مگر پادری سوئے ہوئے مرد اور سوئی ہوئی عورت کے درمیان اسی طرح کھڑا رہا مرد جو کھیت کی نیند سو رہا تھا اور بہار کی آمد آمد کے خواب دیکھ رہا تھا اور عورت جو گزرے ہوئے زمانہ کے ساتھ سو رہی تھی، اور ابدیت کے خواب دیکھ رہی تھی۔

اب پادری مردہ کی چارپائی کے قریب آیا اور دو زانوں بیٹھ گیا۔ جس طرح عبادت گزار قربان گاہ کے سامنے بیٹھتے ہیں اس نے مردہ کا ٹھنڈا ہاتھ اٹھا کر اپنے گرم ہونٹوں سے لگا لیا اور اس کے چہرے کو دیکھنے لگا جس پر موت کی سیاہ چادر پڑی تھی رات کی طرح پر سکون، سمندر کی طرح گہری اور انسانی آرزوؤں کی طرح لرزتی کانپتی آواز میں اس نے کہا۔

''راحیل! میری دینی بیٹی راحیل! میری بات سن! میں اس وقت گفتگو کرنے پر قادر ہوں موت نے میرے لب وا کر دیئے ہیں کہ میں تجھ پر وہ راز ظاہر کر دوں جو خود موت سے زیادہ گہرا ہے اور غم نے میری زبان کے تالے کھول دیئے ہیں کہ میں تجھ پر وہ راز منکشف کر دوں جو خود غم سے زیادہ شدید ہے۔''

اے زمین اور لامحدود فضا کے درمیان پرواز کرنے والی روح! میری روح کا پکار سن! اس نوجوان کی پکار سن! جو کھیت سے واپس آتے ہوئے تجھے دیکھتا تھا۔ تو

تیرے حسن صورت سے مرعوب ہو کر درختوں میں چھپ جاتا تھا۔ اس پادری کی پکار سن!!! جو انسان کا قدیم خدمت گزار ہے۔ خدا کی قسم اب وہ تجھے، بغیر کسی خوف کے بلا رہا ہے، اس لئے کہ جوار خداوندی پہنچ گئی ہے۔

سرگوشی کے انداز میں یہ الفاظ کہہ کر وہ لاش پر جھک گیا اور اس کی پیشانی، آنکھوں اور گردن کے بوسے لینے لگا طویل، گرم اور خاموش بوسے وہ مقدس بوسے جو اس کی روح کے ان تمام اسرار کی پردہ کشائی کر رہے تھے، جن کا تعلق محبت اور غم سے تھا!

اچانک وہ پیچھے ہٹا اور خزاں زدہ پتہ کی مانند، زمین پر گر پڑا گویا راحیل کے برفانی چہرہ کے لمس نے جذبہ ندامت کو اس کے باطن میں بیدار کر دیا تھا۔

وہ اٹھا اور دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو چھپا کر دو زانوں بیٹھ گیا۔ دل ہی دل میں اس نے کہنا شروع کیا۔

"یا رب! میرا گناہ معاف کر دے! میرے معبود! میری کمزوری کو نظر انداز فرما!! میں آخر وقت تک ثابت قدم نہ رہ سکا اور ضبط کا دامن میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ راز جو سات برس تک زندگی نے میری نگاہوں سے پوشیدہ رکھا، موت نے ایک لمحہ میں مجھ پر واضح کر دیا۔ یا رب میرا گناہ معاف کر دے!! میرا معبود! میری کمزوری کو نظر انداز فرمایا!!"

وہ اسی طرح روتا پیٹتا اور دائیں بائیں سر دھنتا رہا۔ وہ راحیل کے مردہ جسم کی طرف جان بوجھ کر نہیں دیکھتا تھا اس خوف سے کہ کہیں اس کے اسرار نفسانی اس کی روح کو پامال نہ کر دیں۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی اور اس نے ان ہیولانی نقوش پر اپنی گلابی چادر ڈال دی جنہیں محبت، مذہب، زندگی اور موت نے بنایا تھا۔

☆☆☆☆☆

قیدی بادشاہ

اپنا دل بھاری نہ کر!! اے قیدی بادشاہ! تیرے قید خانہ تیرے لئے اس قدر ابتلا انگیز نہیں ہے جس قدر میرا جسم میرے لئے ہے!

صبر کر اور اطمینان سے بیٹھ جا!!! اے ہیبت وجلال کے پیکر اعظم! مصائب و آلام سے گھبرانا گیدڑوں کا کام ہے لیکن قیدی بادشاہوں کو زنداں اور داروغہ زنداں کا مذاق اڑانے کے سوا کوئی چیز زیب نہیں دیتی۔

اے عزم وہمت کے پتلے! اپنا غم ہلکا کر اور میری طرف دیکھ! کہ جس طرح تو فولادی سلاخوں میں مقید ہے، میں زندگی کے غلاموں میں گھرا ہوا ہوں، ہم دونوں میں کوئی فرق نہیں، سوائے اس ''خواب پریشان'' کے جو میری روح سے متصل ہے لیکن تیرے قریب آتے ڈرتا ہے۔

ہم دونوں اپنے اپنے وطن سے نکالے ہوئے ہیں

دوستوں اور عزیزوں سے دور! اس لئے پریشان نہ ہو اور میری طرح زمانہ کی سختیوں پر صابر ہو کر ان پست ہمتوں کے ساتھ کہ جو ہم پر اپنے انفرادی حوصلوں سے نہیں بلکہ اپنی کثرت تعداد کی بنا پر غالب ہے۔

اس دہاڑنے اور روکنے سے کیا فائدہ؟ جبکہ لوگ بہرے ہیں اور نہیں سنتے!

تجھ سے پہلے میں بھی بہت چیخ پکار کر چکا ہوں لیکن ظلمت کی پرچھائیوں کے سوا کسی نے دھیان نہ دیا۔ تیری طرح میں نے بھی مختلف انسانی جماعتوں کی چھان بین کی ہے لیکن ان بزدلوں اور کمزوروں کے سوا مجھے کوئی نہ ملا جو ازراہ تمسخر زنجیروں میں جکڑے ہوئے قیدیوں کے سامنے جھوٹی شجاعت کا اظہار کرتے ہیں اور پنجرہ میں مقید زندانیوں سے بیدردی کے ساتھ گستاخیاں!

دیکھ اے شاہ عظمت وجلال ان لوگوں کی طرف دیکھ! جو تیرے پنجرے کے چاروں طرف کھڑے ہیں۔ دیکھ! ان کے چہروں کو غور سے دیکھ! تجھے ان میں وہ

تمام باتیں نظر آئیں گی جو تو گمنام صحراؤں میں اپنے قریب ترین امراء اور خادموں کے چہروں پر دیکھتا تھا ان میں بہت سے اپنی بزدلی کی بنا پر خرگوش، بہت سے اپنی مکاریوں کی وجہ سے لومڑی اور بہت سے اپنی خباثت کے سبب سانپ ہیں لیکن ان میں ایک بھی ایسا نہیں جس میں خرگوش کی صلح پسندی لومڑی کی ذہانت، اور سانپ کی دانائی ہو۔

دیکھ! اس شخص کو دیکھ! جو اپنی گندگی کی بنا پر خنزیر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا، لیکن اس کا گوشت اس قابل نہیں کہ اسے کوئی اپنی غذا بنائے۔

اب اس شخص کو دیکھ! جو اپنی بے وقوفی کے اعتبار سے گدھا معلوم ہوتا ہے، لیکن دو ٹانگوں سے چلتا ہے۔

اب اس شخص کو دیکھ! جو نحوست کے لحاظ سے کوا ہے لیکن اپنی کائیں کو عبادت گاہوں میں فروخت کرتا ہے۔

اور اب اس شخص کو دیکھو! جو غرور ناز میں طاؤس سے مشابہ ہے لیکن اس کے پر مانگے تانگے کے ہیں۔

دیکھ! اے شاہ نہایت منتظر! ان محلوں اور درگاہوں کو دیکھ یہ چھوٹے چھوٹے گھونسلے ہیں جن میں انسان رہتا ہے اور ان طاقی چھتوں پر فخر کرتا ہے۔ جو اسے ستاروں کے نظارہ سے باز رکھتی ہیں ان دیواروں کی پختگی سے خوش ہوتا ہے جو سورج کی شعاعوں کو اس تک نہیں پہنچنے دیتیں۔

یہ اندھیرے غار ہیں جن کے سائے میں جوانی کے پھول کملا جاتے ہیں جن کے گوشوں میں محبت کے دہکتے ہوئے انگارے راکھ ہو جاتے ہیں اور جن کی فضا میں تصورات کے سارے نقوش، دھوئیں کے ستونوں سے بدل جاتے ہیں۔

یہ انوکھی وضع کے تہ خانے ہیں، جن میں بچے کی پلنگڑی مرنیوالے کے بستر کے ہم پہلو ہوتی ہے اور دلہن کا چھپر کھٹ مردہ لاشوں کے قریب!

دیکھ! اے جلیل الشان قیدی! ان چوڑے چکلے بازاروں اور ان تنگ و تاریک گلیوں کو دیکھ! یہ وادیاں ہیں جن کی راہیں دشوار گزار ہیں جن کے گڑھوں میں چور تاک لگائے بیٹھے ہیں اور جن کے کناروں پر باغی چھپے ہوئے ہیں۔

یہ خواہشوں کے میدان جنگ ہیں ان خواہشوں کے میدان جنگ، جن میں روحیں بغیر تلوار کے لڑتی اور بغیر دانتوں کے ایک دوسرے کو کاٹی ہوئی اترتی ہیں۔

بلکہ یہ خوفناک جنگل ہیں جن میں مسمی صورتوں خوشبوؤں میں بسی ہوئی دموں اور چمکدار سینگوں والے جانور رہتے ہیں جو قانون اس لئے نافذ کرتے ہیں کہ محاسن حیات کی حفاظت کریں بلکہ اس لئے جاری کرتے ہیں کہ مکاریوں اور چالبازیوں کو استحکام و دوام حاصل ہو اور جن کے رواجی ضابطے بہتر اور جاندار چیزوں کی بقاء کے لئے نہیں۔ جھوٹ اور بدکاری کی بقاء کے ضامن ہوتے ہیں۔ رہے ان کے بادشاہ سو وہ تیری طرح شیر نہیں بلکہ ایک عجیب وغریب مخلوق ہیں جن کی چونچیں گدھ کی سی ہیں اور چنگل بجوؤں کے سے زبانیں سانپوں کی سی اور ڑمینڈکوں کی سی۔

☆☆☆☆☆

میری جان تجھ پر نثار! اے قیدی بادشاہ میری گفتگو بہت طویل ہو گئی اور میں نے تیرا بہت سا وقت ضائع کر دیا لیکن اپنے مرتبہ سے گرا ہوا دل تخت سے اتارے ہوئے بادشاہوں سے ہی تسلی حاصل کرتا ہے اور غمگین و مقید روح قیدیوں اور غم زدوں ہی سے مانوس ہوتی ہے۔

اس لئے اس نوجوان کو معاف فرما جو اپنی بھوک کو کھانے کی بجائے باتوں سے بہلا رہا ہے اور پیاس کو پانی کی بجائے تصورات سے!

اے قہرمان اعظم! رخصت اگر ہم اس دنیا میں دوبارہ نہ مل سکے تو پرچھائیوں کی دنیا میں ملیں گے جہاں بادشاہوں کی روحیں شاعروں کی روحوں سے ملتی ہیں۔

☆☆☆☆☆

بڑا دن

آج اور ہر سال آج کے دن، انسانیت اپنی گہری نیند سے بیدار ہو کر قوموں کی پرچھائیوں کے سامنے کھڑی ہوتی ہے اور مسیح ناصری کو سولی پر لٹکا ہوا دیکھنے کے لئے اپنی آنکھوں اشک آلود آنکھوں کا مرکز، کوہ جلجلہ کو بنا لیتی ہے اور جب سورج غروب ہونے لگتا ہے تو واپس ہوتی ہے اور ان بتوں کے سامنے سجدہ میں گر پڑتی ہے جو پہاڑ کے دامن یا چوٹیوں پر نصب ہیں۔

آج ایک تصور عیسائیوں کو دنیا کے گوشہ گوشہ سے کھینچ کر۔ بیت المقدس میں پہنچا دیتا ہے جہاں وہ صف باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں اور اس تصویر کو دیکھ دیکھ کر اپنا سینہ کوٹتے ہیں جو سر پر کانٹوں کا تاج رکھے اور آسمان کی طرف ہاتھ پھیلائے موت کے پردہ سے زندگی کی گہرائیوں کو دیکھ رہی ہے لیکن ابھی دن کے مناظر پر، رات اپنے سیاہ پردے ڈالنے بھی نہیں پاتی کہ وہ لوٹتے ہیں اور جہالت و بے حسی کے لحافوں میں نسیان وفراموشی کے زیر سایہ سو جاتے ہیں۔

ہر سال آج کے دن فلسفی اپنے تنگ و تاریک غاروں مفکر اپنے بے کیف حجروں اور شاعر اپنی خیالی وادیوں کو چھوڑ کر ایک بلند پہاڑ پر خاموش و مرعوب جا کھڑے ہوتے ہیں اور اس مرد بزرگ کی آواز پر کان لگا دیتے ہیں جو اپنے قاتلوں کے متعلق کہتا ہے

''اے مقدس باپ! انہیں معاف کر دے کہ یہ نہیں جانتے ہم کیا کر رہے ہیں؟''

لیکن خاموشی، روشنی کی آوازوں کو لپیٹنے بھی نہیں پاتی کہ وہ سب کے سب اپنی روحوں کو پرانی کتابوں کے اوراق میں کفنا دیتے ہیں۔

زندگی کی مادی مسرتوں اور زیور و لباس پر جان دینے والی عورتیں اپنے گھروں سے نکلتی ہیں اس غمگین عورت کو دیکھنے کے لئے جو صلیب کے سامنے اس طرح کھڑی ہے جیسے سرمائی آندھیوں کے سامنے نرم نازک پودا۔ اور اس کی گہری آہوں اور الم

تاکہ سسکیوں کو سننے کے لئے اس کے پاس جاتی ہیں۔

زمانہ کی رو کے ساتھ بہنے والے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں جنہیں مطلق علم نہیں کہ ہم کس طرف بہہ رہے ہیں؟ آج کے دن تھوڑی دیر کے لئے ٹھہر جاتے ہیں اور اس نوجوان عورت مریم مجدلیہ کو مڑ کر دیکھتے ہیں جو زمین و آسمان کے درمیان کھڑے ہوئے مرد کے پاؤں کا خون اپنے آنسوؤں سے دھوتی ہے لیکن جب ان کی نگاہیں اس منظر کو دیکھتے دیکھتے اکتا جاتی ہیں تو ہنستے ہوئے تیزی سے بھاگ جاتے ہیں۔

ہر سال آج کے دن انسانیت بہار کی بیداری کے ساتھ جاگتی ہے اور مسیح کی تکلیفوں پر روتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوتی ہے اس کے بعد اپنی آنکھیں بند کر لیتی ہے اور پھر گہری نیند سو جاتی ہے لیکن بہار بیدار رہتی ہے اور ایک خوشگوار تبسم کے ساتھ مصروف گلگشت یہاں تک کہ موسم گرما سے بدل جاتی ہے۔ جس کا لباس زریں ہوتا ہے اور دامن معطر۔

انسانیت وہ عورت ہے جو عظیم ترین شخصیتوں پر ماتم کرنے اور رونے پیٹنے سے خوش ہوتی ہے لیکن اگر وہ مرد ہوتی تو ان کی عظمت وجلالت سے مسرور ہوتی۔

انسانیت ایک بچہ ہے جو ذبح شدہ پرندے کے پاس کھڑے ہو کر چیخ پکار مچاتا ہے لیکن اس خوفناک آندھی سے لرزہ براندام ہوتا ہے جو اپنے جھونکوں سے خشک ٹہنیوں کو توڑ ڈالتی اور بدبودار نجاستوں کو اڑا لے جاتی ہے۔

انسانیت مسیح ناصری کو فقیروں کی طرح پیدا ہوتے، مسکینوں کی طرح زندگی بسر کرتے، کمزوروں کی طرح تکلیف اٹھاتے اور مجرموں کی طرح سولی چڑھتے دیکھتی ہے اور روتی ہے واویلا مچاتی ہے نوحہ ماتم کرتی ہے اور یہ سب کچھ مسیح کی عزت و تکریم کے لئے ہوتا ہے۔

1900 برس سے انسان مسیح کی شکل میں کمزوری کو پوج رہا ہے۔ حالانکہ مسیح قوی تھا لیکن حقیقی قوت کے مفہوم سے دنیا ناواقف ہے۔

مسیح نے خوف و مسکینی کی زندگی بسر کی نہ درد و شکایت کے عالم میں بلکہ انقلابیوں کی طرح زندگی گزاری، باغیوں کی طرح سولی چڑھا اور اہل ہمت کی طرح موت کو لبیک کہا۔

مسیح شکستہ پر طائر نہیں، پر جوش آندھی تھا جس نے اپنے تند و تیز جھونکوں سے تمام خمیدہ بازوؤں کو ریزہ ریزہ کر ڈالا۔

مسیح فضائے نیلگوں سے غم کو زندگی کی رمز بنانے کے لئے نہیں زندگی کو حق و آزادی کی رمز بنانے آیا تھا۔

مسیح نہ تو اپنے دشمنوں اور ظالموں سے خائف تھا اور نہ اپنے قاتلوں سے دردناک بلکہ وہ ایک کھلا ہوا حریت پسند تھا جس نے ظلم و استبداد کا جرات سے مقابلہ کیا جہاں کہیں مکروہ پھوڑا دیکھا نشتر لگایا جہاں کہیں شور کر بولتے سنا، گونگا کر دیا اور جہاں کہیں ریاکاری کو پایا فنا کے گھاٹ اتار دیا۔

مسیح نور کے اس بلند دائرہ سے اس لئے نہیں اترا تھا کہ مکانوں کو ڈھا کر ان کی اینٹوں سے خانقاہیں اور عبادت کدے تعمیر کرے یا طاقت وروں کو لبھا کر کہانت و رہبانیت کی طرف ان کی رہنمائی کرے بلکہ وہ فضا عالم میں ایک جدید اور قوی روح پھونکنے اترا تھا، جو مردہ کھوپڑیوں کے ڈھیر پر رکھے ہوئے تختوں کو مسمار کر دیتی ہے، قبروں پر بنے ہوئے بلند و عالی شان محلوں کو ڈھا دیتی ہے اور مسکین و کمزور جسموں پر نصب شدہ بتوں کو پاش پاش کر ڈالتی ہے۔

مسیح لوگوں کو اس بات کی تعلیم دینے نہیں آیا تھا کہ وہ چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں اور سرد تاریک مکانوں کے پہلوؤں میں بلند و بالا عبادت گاہوں اور عالی شان کلیساؤں کی بنیاد رکھی بلکہ اس لئے آیا تھا کہ انسان کے دل کلیسا اس کی روح کو قربان گاہ اور اس کی عقل کو پادری بنائے۔

یہ ہیں وہ کارنامے جو مسیح کی ذات سے ظہور میں آئے اور یہ ہے وہ تعلیم جس کی

وجہ سے اسے پکڑ کر سولی پر چڑھا دیا گیا۔ اگر انسان ان نکتوں کو سمجھتا تو آج کے دن خوشیاں مناتا اور فتح و نصرت کے گیت گاتا۔

☆☆☆☆☆

اور تو، اے صاحب عظمت و جلال مصلوب! جو جلجلہ کی بلندیوں سے مختلف نسلوں کو دیکھ رہا ہے، قوموں کی چیخ و پکار سن رہا ہے۔ اور ابدیت کے خوابوں کی حقیقت سمجھ رہا ہے تو خون میں لتھڑی ہوئی صلیب پر ہزار تختوں پر ہزار بادشاہوں سے زیادہ ہیبت و جلال رکھتا ہے جان کنی اور موت کے درمیان ہزار معرکوں کی ہزار فوجوں کے ہزار سپہ سالار سے زیادہ بہادر اور باوقار ہے!

تو اپنے غم میں بھی گل آفریں بہار سے زیادہ مسرور ہے تیرا دل درد کی شدت کے باوصف فرشتوں کے دل سے زیادہ پر سکون ہے اور تو جلادوں میں گھرا ہوا ہونے کے باوجود سورج کی کرنوں سے آزاد ہے۔

یہ کانٹوں کا تاج، جو تیرے سر پر رکھا ہے، بہرام کے تاج سے زیادہ حسین اور قیمتی ہے، یہ میخیں جو تیری ہتھیلیوں میں ٹھکی ہوئی ہیں چوگان مشتری سے زیادہ قدر و مرتبہ رکھتی ہیں اور خون کے یہ قطرے جو تیرے قدموں پر منجمد ہیں، عشتروت کی مالاؤں سے زیادہ چمکدار ہیں۔

ان کمزوروں سے باز پرس نہ کر! انہیں معاف فرما کہ انہیں علم نہیں، تو موت کے لئے موت سے لڑا اور مردوں کو زندگی عطا فرما گیا۔

☆☆☆☆☆

رنگے ہوئے لیڈر

سلمان آفندی

پینتیس سالہ مرد خوش پوشاک، خوش قامت چڑھی ہوئی مونچھیں پاؤں میں چمکدار جوتا اور ریشمیں جرابیں، منہ میں قیمتی سگریٹ اور ہاتھ میں حسین و نازک بیت، جس کی سنہری موٹھ، اعلی درجہ کے جواہر سے مرصع، عالی شان ہوٹلوں میں کھانا کھاتا ہے جہاں شہر کے بڑے بڑے لوگ جمع ہوتے ہیں اور شاندار گاڑی میں مشہور تفریحی مقامات کی سیر کو جاتا ہے جسے دو نہایت نفیس گھوڑے کھینچتے ہیں۔

سلمان آفندی کو اپنے باپ سے ایک کوڑی ورثہ میں نہیں ملی۔ اللہ بخشے اس کا باپ ایک غریب اور مفلس آدمی تھا۔ جس نے کبھی تجارت کی نہ دولت کمائی، وہ حد درجہ سست اور کاہل تھا، کام سے نفرت کرتا اور اسے اپنے مرتبہ سے گری ہوئی چیز سمجھتا ہم نے ایک مرتبہ خود اس کی زبان سے سنا ہے کہ

”میرا جسم اور میری فطرت کام سے میل نہیں کھاتی، کام ان لوگوں کے لئے پیدا کیا گیا ہے جن کی فطرت بے کیف اور جسم کھردرے ہیں۔“

تو پھر سلمان آفندی نے اتنی دولت کہاں سے حاصل کی اور وہ کونسا جادوگر تھا جس نے مٹی کو اس کی مٹھیوں میں سونے چاندی سے بدل دیا؟

یہ رنگے ہوئے لیڈروں کے بے شمار رازوں میں سے ایک راز ہے جو عزرائیل نے ہمیں بتایا اور اب ہم تمہیں بتاتے ہیں۔

پانچ برس ہوئے کہ سلمان آفندی نے سیدہ فمیہ سے شادی کی۔ سیدہ فمیہ مرحوم بطرس نعمان تاجر کی بیوہ ہے جو اپنی کوشش استقلال اور دیانت کے لئے اپنے تمام ہمسروں میں شہرت رکھتا تھا۔ اس وقت سیدہ فمیہ کی عمر پینتالیس سال ہے اور اس کے جذبات عمر 16 سال وہ ہر چند اپنے بالوں میں اور آنکھوں میں سرمہ لگاتی ہے اپنے چہرہ کو کریم اور پاوڈر سے چمکاتی ہے لیکن سلمان آفندی آدھی رات سے پہلے

کبھی گھر میں نہیں گھستا۔ شاید ہی کوئی گھڑی ہوتی ہو، جب وہ اپنے شوہر کی تیز تیز نظروں اور نا ملائم کلمات سے محفوظ رہتی ہو، جس کی وجہ یہ ہے کہ سلمان آفندی نے اس کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں اور اس دولت کو دونوں ہاتھوں سے لٹا رہا ہے جو اس کے پہلے شوہر نے خون پسینہ ایک کر کے جمع کی تھی۔

☆☆☆☆☆

IqbalCyberLibrary.Net All Rights reserved ©2002-2006

2

ادیب آفندی

ستائیس سالہ جوان لمبی ناک چھوٹی چھوٹی آنکھیں، ناپاک چہرہ ہاتھ روشنائی میں بھرے ہوئے، ناخن میل سے اٹے ہوئے جسم پر پھٹے پرانے کپڑے جن پر جابجا تیل، چکنائی اور قہوے کے داغ۔

اس مکروہ حالت کا سبب، ادیب آفندی کی غربت ومحتاجی نہیں، غفلت و بے پروائی ہے، وہ مصروفیت ہے جس نے بلند مسائل، معنوی امور اور الہیاتی مباحث کی تحقیق و تلاش کے سلسلے میں اس کے دماغ کو گھیر رکھا ہے، چنانچہ ہم نے خود اسے امین جندی سے کہتے سنا ہے کہ

''طبیعت دو چیزوں کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتی''

یعنی ادیب ایک وقت میں انشاء پردازی اور پاکیزگی دونوں کا خیال نہیں رکھ سکتا۔

ادیب آفندی بہت بولتا ہے اور ہر وقت بولتا ہے۔ اس کے نزدیک بولنا دنیا کی ہر چیز سے افضل ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ اس نے بیروت کے کسی مدرسہ میں دو سال تک ایک مشہور استاد سے علم بدیع کا درس لیا ہے اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اس نے بہت سی نظمیں کہی ہیں، مضامین لکھے ہیں اور کتابیں مرتب کی ہیں، جو مختلف اسباب کی بنا پر جن میں سب سے بڑا سبب عربی صحافت کا انحطاط اور پڑھنے والوں کی جہالت ہے، ہنوز طبع و اشاعت سے محروم ہیں۔

کچھ دنوں سے ادیب آفندی اپنی توجہ قدیم وجدید فلسفے کی باریکیوں پر صرف کر رہا ہے وہ ایک ہی وقت میں سقراط کا بھی عقیدت مند ہے اور نطشے کا بھی۔ وہ اگنٹس کے ملفوظات بھی اسی شوق و دلچسپی کے ساتھ پڑھتا ہے جس شوق و دلچسپی کے ساتھ والٹیر اور ژان ژاک روسو کی کتابیں۔

ہم پہلی مرتبہ اس سے ایک اوی میں ملے تھے لوگ اس کے چاروں طرف نغمہ و شراب میں مست تھے اور وہ اپنے مشہور بلیغ انداز میں شیکسپیر کے ڈرامہ ہملٹ پر تبصرہ کر رہا تھا۔

دوسری مرتبہ ہم نے اسے ایک رئیس کے جنازہ میں دیکھا لوگ اس کے ہم پہلو غمگین چہرے بنائے سر جھکائے آہستہ آہستہ چل رہے تھے اور وہ اپنی مخصوص فصیح البیانی کے ساتھ فارض کی غزلوں اور رابونواس کی خمریات پر بحث کر رہا تھا۔

ان حالات میں ادیب آفندی کیوں جی رہا ہے۔ پرانی کتابوں اور بوسیدہ اوراق میں اپنے شب و روز برباد کرنے سے اس کا کیا مقصد ہے۔ وہ ایک گدھا کیوں نہیں خرید لیتا اور اسے کرایہ پر چلا کر دولت مند کرایہ خوروں کی صف میں شامل کیوں نہیں ہو جاتا۔

یہ رنگے ہوئے لیڈروں کے بے شمار رازوں میں سے ایک راز ہے جو بعلو پول نے ہمیں بتایا اور ہم اب تمہیں بتاتے ہیں؟

تین برس ہوئے کہ ادیب آفندی نے پادری یوحنا شمعون کی شان میں ایک قصیدہ لکھا اور حبیب بک سلوان کے گھر میں اس کے سامنے پڑھا۔ قصیدہ ختم ہو جانے کے بعد پادری نے اسے بلایا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

”بیٹا! خدا تجھے سلامت رکھے تو بڑا نکتہ رس شاعر اور فطرت شناس ادیب ہے، میں تجھ جیسے باکمالوں پر فخر کرتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ تو ایک دن مشرق کی بڑی شخصیتوں میں شمار کیا جائے گا۔“

اس دن سے لے کر آج تک ادیب آفندی اپنے باپ، چچا اور ماموں کی تحسین و ستائش کا مرکز ہے۔ وہ فخر کے ساتھ اس کا ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔

”کیا پادری یوحنا شمعون نے ارشاد نہیں فرمایا تھا کہ وہ ایک دن مشرق کی بڑی شخصیتوں میں شمار کیا جائے گا۔“

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

3

فرید وعیپس

چالیس سال کا پختہ عمر انسان لمبا قد، چھوٹا سا سر، بڑا دہانہ، تنگ پیشانی، اکڑی ہوئی گردن کے ساتھ، سینہ نکال کر آہستہ آہستہ چلتا ہے۔ اس کی رفتار اس اونٹ کی رفتار سے متوازن ہے جس کی پیٹھ پر محمل ہو، جب وہ بلند آواز اور پر وقار آواز میں گفتگو کرتا ہے تو انجان آدمی یہ سمجھتا ہے کہ حکومت کا کوئی وزیر لوگوں کے معاملات سدھارنے اور رعایا کی تکلیفیں دور کرنے میں مصروف ہے۔

فرید بک کو اس کے سوا کوئی نہیں کہ محفلوں میں صدر مقام پر بیٹھے اور اپنے بزرگ خاندان کے کارنامے گنوائے یا اپنی عالی نسبی کی خصوصیات بیان کرے۔ وہ نپولین اور عنترہ عبسی جیسے بہادروں اور بڑے لوگوں کے حالات اور کارنامے بہت دلچسپی سے سناتا ہے۔ نفیس اسلحہ جمع کرنے کا اسے خاص شوق ہے اور وہ اس کے گھر کی دیواروں پر ترتیب سے چنے ہوئے بھی ہیں لیکن وہ ان کو استعمال کرنا نہیں جانتا۔

اس کا قول ہے کہ

‘‘اللہ نے انسان کو دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے ایک گروہ خدمت کرنے کے لئے ہے اور دوسرا گروہ خدمت لینے کے لئے’’

اس کا دوسرا قول یہ ہے کہ

‘‘خاندان ایک اڑیل ٹٹو ہے جو اس وقت تک نہیں چلتا، جب تک کوئی اس کی پیٹھ پر سوار نہ ہو جائے۔’’

یہ تیسرا قول بھی اسی سے منسوب ہے کہ

‘‘قلم کمزوروں کے لئے ہے اور تلوار قوت والوں کے لئے’’

اچھا تو وہ اسباب کیا ہیں؟ جن کی بنا پر فرید بک اپنی بڑائی کے لئے شیخیاں مارتا ہے؟ ہر وقت اور ہر جگہ پر غرورانداز میں اپنی عالی نسبی کا ڈھنڈورا پیٹتا ہے اور خود بینی

وخود پسندی کا اظہار کر کے لوگوں پر اپنی فوقیت جتاتا ہے۔

یہ رنگ ہوئے لیڈروں کے بے شمار رازوں میں سے ایک راز ہے جو سطنا ئیل نے ہمیں بتایا اور ہم اب تمہیں بتاتے ہیں۔

انیسویں صدی کے ثلث اول میں سلطان بشیر شہابی اپنے امیروں کے ساتھ لبنان کی وادیوں کی سیر و تفریح کے لئے آیا۔ اتفاق کی بات جب وہ اس گاؤں کے قریب سے گزرا جس میں فرید بک وعیبس کا دادا منصور وعیبس رہتا تھا تو دھوپ تیز ہو گئی اور سورج کی باریک باریک کرنیں زمین کا سینہ چھیدنے لگیں۔ سلطان گرمی کی تاب نہ لا کر گھوڑے سے اتر پڑا اور ساتھیوں سے کہا۔

"آؤ! تھوڑی دیر اس بلوط کے سائے میں دم لے لیں!!"

جب منصور بک عیبس کو اس کا علم ہوا تو اس نے اپنے ہمسایہ کسانوں کو بلایا اور انہیں خبر دی کہ سلطان ان کے گاؤں کے قریب رونق افروز ہیں یہ سن کر وہ سب کے سب انجیر اور انگور کے خوان اور دودھ شراب اور شہد کی ٹھلیاں لئے منصور کے پیچھے پیچھے بلوط کے درخت کی طرف چلے جہاں سلطان بشیر شہابی قیام فرما تھا۔ منزل مقصد پر پہنچ کر منصور عیبس آگے بڑھا اور عبائے شاہی کو بوسہ دیا پھر اس کے قدموں میں ایک بکرا ذبح کیا اور بلند آواز میں کہا

"یہ سب جہاں پناہ کے مراحم خسروانہ کا اثر ہے۔"

سلطان نے اظہار خوشنودی کے طور پر اسے خلعت عطا فرمایا اور کہا

"تم آج سے اس گاؤں کے سردار ہو، جسے ہماری خصوصی نوازتی رہیں گی، جاؤ! ما بدولت نے تمہارے گاؤں پر اس سال شاہی ٹیکس معاف فرما دیا۔"

امیر کے چلنے جانے کے بعد، اس رات کو گاؤں کے تمام آدمی سردار منصور عیبس کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسے اپنے رنج و راحت کا آقا تسلیم کر لیا اللہ ان سب پر رحم کرے!

☆☆☆☆☆

رنگے ہوئے لیڈروں کے اور بھی بہت سے راز ہیں جن سے شیطان ہمیں دن رات آگاہ کرتے رہتے ہیں اور ہم اس سے پہلے کے زمانہ ہمیں فضائے نیلگوں کے اس پار پہنچا دے تمہیں ان سے آگاہ کریں گے لیکن اس وقت، رات آدھی ہو چکی ہے اور بیداری نے ہماری پلکوں کو تھکا دیا ہے۔ اس لئے ہمیں سونے کی اجازت دو بہت ممکن ہے خوابوں کی پری ہماری روحوں کو اس عالم میں لے جائے جو اس عالم سے کہیں زیادہ پاک وصاف ہے۔

☆☆☆☆☆

پری

تو مجھے کہاں کھینچے لئے جا رہی ہے، اے ساحرہ!

میں کہاں تک ان پر خار و ناہموار چٹانی راہوں پر تیرے ساتھ چلوں جو ہمارے قدموں کو تو بلندی کی طرف لے جا رہی ہیں لیکن ہماری روحوں کو پستی کی طرف دھکیل رہی ہیں!

میں نے تیرا دامن پکڑا، اور اس بچہ کی طرح، جو ہر وقت اپنی ماں سے چمٹا رہتا ہے، تیرے ساتھ ہولیا، میں نے اپنے تمام تصورات کو بھلا کر، تیرے حسن پر نگاہیں جما دیں اور اپنے سر کے گرد منڈلاتی ہوئی پرچھائیوں کی طرف سے آنکھیں بند کر کے اس مقناطیسی قوت کی طرف کھینچ لیا جو تیرے جسم میں پوشیدہ ہے۔

تھوڑی دیر کے لئے ٹھہر جا کہ میں تیری صورت دیکھ لوں، بس ایک نظر مجھ پر ڈال دے کہ بہت ممکن ہے میں تیری آنکھوں میں تیرے دل کے بھید پا لوں اور تیرے خد وخال سے تیری روح کی باریکیوں کو سمجھ لوں۔

ذرا کی ذرا ٹھہر جا! اے پری! کہ میں چلتے چلتے تھک گیا ہوں اور میری روح راستہ کی خوفناکیوں سے تھرا رہی ہے!! ٹھہر کہ! ہم اس دوراہے پر پہنچ گئے ہیں جہاں موت، زندگی سے ہمکنار ہے اب میں ایک قدم آگے نہ بڑھاؤں گا۔ جب تک میری روح تیری روح کے ارادوں سے واقف اور تیرے دل کے بھیدوں سے آشنا نہ ہو جائے گا۔

میری سن! اے طلسم کار پری!

کل تک میں ایک آزاد پرندہ تھا جو دن بھر نہروں پر منڈلاتا اور فضا میں اڑتا تھا اور شام ہوتے، کسی شاخ پر بیٹھ کر، رنگا رنگ بادلوں کی بستی میں ان محلوں اور عبادت گاہوں کا نظارہ کرتا تھا، جنہیں سورج سپہر کو بناتا تھا اور غروب ہوتے وقت ڈھا دیتا ہے!

بلکہ میں ایک خیال تھا، جو زندگی کی خوبیوں اور لذتوں سے مسرور ہوتے ہوئے اور ہستی کے اسرار و رموز کا کھوج لگاتے ہوئے، دنیا کے مشرق و مغرب کا تنہا چکر لگاتا تھا۔

نہیں، بلکہ ایک خواب تھا۔ جو رات کے پردوں پر، کھڑکیوں کی درزوں میں سے داخل ہوتا اور سوتی ہوئی حسین اچھوتیوں کی خواب گاہ میں ان کے جذبات سے کھیلتا تھا، نوجوانوں کی مسہریوں کے پہلو میں کھڑے ہو کر ان کی آرزوؤں کو بھڑکاتا تھا اور بوڑھوں کے بستر کے پاس بیٹھ کر ان کے خیالات کی ٹوہ لگاتا تھا۔

لیکن آج جبکہ اے ساحرہ، میں تجھ سے مل چکا ہوں اور تیرے ہاتھوں کے بوسہ نے میری ہر رگ و ہر ریشہ میں زہر کی سی تلخی پیدا کر دی ہے۔ اس قیدی کی مثال ہو گیا ہوں جو زنجیروں میں جکڑا ہوا نہ معلوم کہاں جا رہا ہے؟ بلکہ اس مخمور کی مثال ہو گیا ہوں جو مئے ہوشربا کے جام پر جام چڑھا رہا ہو اور ان ہاتھوں کو بوسہ دے رہا ہو جنہوں نے اس کے چہرہ پر طمانچہ مارا ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

لیکن اے ساحرہ! ذرا ٹھہر اور دیکھ کہ میں نے اپنی تمام قوتیں واپس لے لی ہیں، ان زنجیروں کو توڑ دیا ہے جو میرے پاؤں میں پڑی تھیں اور اس پیالہ کو چور چور کر دیا ہے جس میں میں نے خوشگوار اپنی دانست میں خوشگوار زہر پیا تھا۔ بتا! اب ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ کس راستہ پر چلنا چاہئے۔

میں پھر آزاد ہو گیا ہوں! کیا اب تو مجھے اپنا آزاد رفیق بنانے پر راضی ہے؟ جو سورج کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا ہے اور غیر مرتعش انگلیوں سے دہکتے ہوئے انگاروں کو پکڑ لیتا ہے۔

میرے بازو پھر کھل گئے ہیں! کیا اب تو اس نوجوان کے ساتھ رہنے پر تیار ہے؟ جو اپنے دن عقاب کی طرح پہاڑوں میں گزارتا ہے اور راتیں شیر کی طرح جنگلوں

میں!

کیا اب تو اس مرد کے شوق کو کافی سمجھتی ہے؟ جو محبت کو اپنا دم ساز تو بنا سکتا ہے لیکن پیشوا نہیں بنا سکتا!!

کیا اب تو اس دل کی محبت پر قناعت کرتی ہے؟ جو آرزو مند تو ہو سکتا ہے لیکن اطاعت نہیں کر سکتا! بھڑک تو سکتا ہے لیکن پگھل نہیں سکتا۔

کیا اب تو ان تمناؤں پر اعتماد کرتی ہے جو آندھی کے سامنے کانپ تو سکتی ہیں! لیکن پامال نہیں ہو سکتی! بگولوں کے ساتھ اٹھ تو سکتی ہیں لیکن اپنی جگہ نہیں چھوڑ سکتیں!!

کیا اب تو مجھے اپنا ساتھی بنانے پر تیار ہے؟ جو نہ کسی کو پوجنا چاہتا ہے نہ خود کو پجوانا۔

اچھا تو لے، یہ میرا ہاتھ ہے اسے اپنے حسین ہاتھ سے متحریک کر، یہ میرا جسم ہے، اسے اپنی نرم و نازک باہوں میں بھینچ لے اور یہ میرے لب ہیں، انہیں ایک طویل، عمیق اور خاموش بوسہ دے!

☆☆☆☆☆

نقش قدم

میں ایک دفعہ کسی اور سیاح سے ملا، وہ بھی کچھ مجنوں سا ہی تھا اور وہ مجھ سے یوں گویا ہوا۔

''میں تو ایک آواز ہوں۔ اور اکثر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس زمین پر میں انسانوں میں نہیں بلکہ انسانوں پر چلتا ہوں۔ اور اپنے کھلے اور وسیع کھیتوں میں میرے قدموں کے نشانوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں دیکھ سکتے!''

اور اکثر میں نے انہیں، اپنے پاؤں کے ان نشانوں کے غیر معمولی پیائش پر بحث کرتے، جھگڑتے سنا ہے۔ کیونکہ پیشتر یہی خیال کرتے ہیں۔ کہ یہ کسی بلا کے پاؤں کے نشان ہیں۔ جس کی آج سے صدیوں پہلے کہیں ادھر گزرگاہ تھی! اور بعض کہتے ہیں نہیں ان گڑھوں میں دور چمکنے والے ستاروں سے شہاب ٹوٹ کر گرتے رہے ہیں!

مگر اے میرے دوست، ایک صرف تم جانتے ہوں کہ یہ سوائے اک آوارہ گرد کے پاؤں کے نشانوں کے اور کچھ بھی نہیں!

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

تیراک

ایک دفعہ سالمیز کے دو مسافروں کا راستے میں میل ہو گیا، چلتے چلتے دوپہر کے قریب وہ ایک ایسے دریا پر پہنچے، جس کے وسیع پاٹ کو پار کرنے کے لئے نہ کوئی ناؤ تھی، اور نہ ہی کوئی پل! اب یا تو وہ دریا کو تیر کر پار کریں یا پھر کسی نئی راہ کی تلاش کریں! ایک نے دوسرے سے کہا۔

”آؤ پھر تیر ہی کر پار کریں اسے“

آخر دریا، اتنا چوڑا بھی تو نہیں ہے!

دونوں نے اپنے آپ کو دریا میں پھینک دیا۔

ان دونوں میں سے ایک کا جو دریا اور دریا کے راستوں سے خوب آشنا تھا۔ آدھے ہی راستے میں دم پھول گیا۔ اور تیز بہتے ہوئے پانی کے ساتھ ساتھ وہ کنارے سے دور ہی دور بہتا گیا۔

اور دوسرا، جس نے اس سے پہلے کبھی دریا کا منہ تک نہیں دیکھا تھا۔ اور نہ تیرانا ہی جانتا تھا۔ بالکل سیدھا تیر کر دریا کے دوسرے کنارے جا پہنچا مگر اب جو اس نے اپنے ساتھی کو پانی میں غوطے کھاتے دیکھا تو اسے پانی میں پھر کودنا پڑا!

وہ اسے بھی بچا کر کنارے پر لے آیا!

دریا کے تیز بہتے ہوئے پانی کے تھپیڑوں نے اس کا برا حال کر دیا تھا۔ کنارے پر پہنچ کر اپنے ساتھی سے بولا

”دوست تم تو بتا رہے تھے کہ تم نے کبھی پانی کا منہ تک نہیں دیکھا مگر دریا تو اس بے تکلفی سے پار کیا ہے کہ میں بھی حیران ہوں۔“

دوسرے نے کہا بھائی تم شاید میرے اس کمر بند کو نہیں دیکھ رہے۔ اس میں اشرفیاں بھی بھری ہوئی ہیں۔ اور انہیں میں نے اپنے بیوی بچوں کے لئے ایک ایک کر کے جمع کیا ہے۔

میری سال بھر کی کمائی!

اور یہ اسی طلائی کمر بند کا بوجھ تھا۔ جو مجھے دریا کے پار لے آیا، دریا کے اس کنارے سے اس کنارے پر، میری بیوی اور میرے بچوں کے پاس! جب میں دریا میں تیر رہا تھا۔ تو میری بیوی اور میرے بچے میرے کندھوں پر تھے۔

اور وہ دونوں پھر ایک ساتھ سلامیز کے راستے پر ہو لئے!

☆☆☆☆☆☆

All Rights Reserved
©2002-2006

سکوت جنوں خیز

گرما کی ایک صبح مینڈک نے مینڈکی سے کہا

"میرا خیال ہے کہ لوگ جو جھیل کے ادھر رہتے ہیں۔ ہمارے رات کے ٹرانے سے بے آرام تو ضرور ہوتے ہوں گے!"

مینڈکی بولی

"تو جیسے دن کو وہ اپنی بکواس سے ہمارے آرام میں خلل انداز نہیں ہوتے؟"

مینڈک نے کہا

"کچھ بھی ہو مگر ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ ہم ٹراتے کچھ زیادہ ہی ہیں!"

مینڈکی بولی

"اور ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ دن کو وہ ضرورت سے کچھ نہ کچھ زیادہ ہی چلاتے اور شور مچاتے ہیں!"

مینڈک بولا

"پر بھئی اس مینڈک کا بھی خیال کیا کبھی تم نے، جو رات بھر اپنے شور سے پڑوسیوں کا ناک میں دم کر دیتا ہے!"

مینڈکی نے کہا

"ہاں مگر اس قاضی، کیمیا گر اور ملا کا بھی کبھی خیال کیا تم نے کہ دن بھر اپنے بے ربط شور سے بے پناہ ہنگامے سے فضا کو خراب کرتے رہتے ہیں!"

مینڈک بولا

"ارے بھئی چھوڑو انہیں ہمیں کم از کم ان انسانوں سے تو بہتر ہونا چاہئے تا اب ہم رات کو خاموش رہیں گے اپنے گیت دل میں رکھیں گے۔ چاہے چاند ہماری موسیقی کے لئے اور ستارے ہمارے گیتوں کے لئے چلاتے ہی کیوں نہ رہیں!"

مینڈکی بولی

تو جیسے تمہاری مرضی دیکھیں جو یوں تمہارے من کو چین مل جائے! اس رات مینڈک خاموش رہے۔ اور دوسری رات بھی نہ ٹرائے اور تیسری رات بھی!

لیکن اس پر قصہ یوں ہوا کہ وہ باتونی عورت جو جھیل کے ادھر والے کنارے پر رہتی تھی تیسری صبح ناشتے پر اپنے گھر والے سے شکایت کر رہی تھی

میں تین رات سے بالکل نہیں سوئی پہلے جب مینڈنگ موئے ٹراتے تھے۔ تو کم از کم نیند تو آ جاتی تھی۔ اب جانے تین رات سے انہیں کیا ہوا ہے۔ سانپ سونگھ گیا ہے کہ بالکل ٹراتے ہی نہیں اور ادھر بے خوابی سے میرا دماغ پھٹا جاتا ہے!

مینڈنگ نے سنا تو مینڈکی کی طرف مڑ کر آنکھ سے اشارہ کرتے ہوئے بولا

''اس خاموشی سے ہم بھی تو پاگل ہوئے جاتے تھے نہیں کیا؟''

مینڈکی بولی

''ہاں کیوں نہیں رات کا یہ سناٹا ہمارے لئے بھی تو وبال ہی بنا ہوا تھا۔ مگر تم نے تو دیکھ لیا نا کہ ہمارے لئے خاموش رہنا ایک سرے سے ضروری ہے ہی نہیں، اور پھر ان کی خاطر جو اپنے خلا کو شور سے بھرا رکھنا چاہتے ہوں!''

اس رات ان کی موسیقی کے لئے چاند کی پکار اور ان کے گیتوں کے لئے ستاروں کی فریاد خالی نہ گئی!

☆☆☆☆☆

انمول موتی

ایک صدف نے دوسرے سے کہا

’’میرے اندر درد ہے بڑی شدت کا درد! بوجھل اور گول سا اور میں بہت ہی تکلیف میں ہوں!‘‘

دوسرے صدف نے بڑی نخوت سے کہا

’’سب ستائش ہے آسمانوں کے خدا کے لئے، میں تو اندر باہر سے بالکل ٹھیک ہوں۔‘‘

اسی وقت ایک کیکڑا جو پاس سے گزر رہا تھا۔ اور اس نے ان دونوں کی باتیں بھی سنی تھیں، بولا۔

’’ہاں تم اندر باہر سے بالکل ٹھیک ہو لیکن جو درد تیرے پڑوسی کے ہے وہ ایک انمول موتی ہے!‘‘

☆☆☆☆☆

ایک ہزار قید خانے

آج سے ہزاروں سال پہلے ایک بہت بڑا بادشاہ ایک بہت ہی بڑے **ملک** پر حکومت کرتا تھا!

بادشاہ انصاف پسند تھا۔ اور نہایت ہی دانش مند بھی اس کے ساتھ ہی ساتھ بہت ہی رحم دل وہ اپنی رعایا کے لئے اچھے اچھے قانون بنانا چاہتا تھا۔

اس مطلب کے لئے اس نے ہزار مختلف قبیلوں سے ایک ہزار دانس مند طلب کئے کہ اس کے پایہ تخت میں جمع ہو کر قانون مرتب کریں۔

اور وہ ہزار دانش مند اس کام کو انجام دینے کے لئے اس کے سایہ تخت میں جمع ہو گئے!

لیکن جب ان ایک ہزار دانش مندوں نے ایک ہزار قانون ترتیب دے کر بادشاہ کے حضور پیش کئے۔ اور اس نے انہیں پڑھا تو اسے بہت دکھ ہوا۔ وہ اپنے دل میں بہت رویا، کیوں کہ یہ اس کے علم میں نہیں تھا کہ اس کے **ملک** میں ایک ہزار قسم کے جرم کئے جاتے ہیں پھر اس نے اپنے نوشتہ دار کو طلب کیا اور بڑی ہی خود اعتمادی کے ساتھ مسکراتے ہوئے اسے خود چند قانون لکھوائے اور قانون گنتی میں صرف سات تھے۔

اس پر وہ ایک ہزار دانش مند اس سے ناراض ہو کر، اپنے اپنے قبیلوں میں ان قوانین کو لے کر واپس چلے گئے، جنہیں انہوں نے خود وضع کیا تھا اور ہر قبیلہ اپنے اپنے قبیلے کے بزرگ کے بنائے ہوئے قانون پر کاربند ہو گیا!

آج تک ان قبیلوں میں، اسی لئے وہی ایک ہزار قانون رائج ہیں! یہ ایک بہت بڑا **ملک** ہے اس میں ایک ہزار قید خانے ہیں اور ان قید خانوں میں ایسے مرد ایسی عورتیں اور ایسے بچے بھرے ہوئے ہیں جو ہزاروں قانون روز توڑتے ہیں!

بے شک یہ ایک بہت بڑا **ملک** ہے

یہ بہت ہی بڑا **ملک** ہے اور اس کی آبادی، ان ایک ہزار قانون سازوں کی اولاد کے دم سے ہے جن میں صرف ایک دانش مند بادشاہ تھا!

☆☆☆☆☆

IqbalCyberLibrary.Net
All Rights Reserved
©2002-2006

زندگی اور عورت

میں نے اپنے دوست سے کہا

''تم آج اسے جس طرح اپنے بازو پر جھکا ہوا دیکھ رہے ہو۔ کل بالکل اسی طرح وہ میرے بازو پر جھکی ہوئی تھی''

میرے دوست نے کہا

''اور کل وہ میرے بازو پر جھکی ہوگی!''

میں نے کہا

''ذرا دیکھو تو کس طرح اس کی گود میں پڑی ہے کل اس طرح میری گود میں پڑی تھی!''

میرا دوست بولا

''اور بالکل اسی طرح کل وہ میری گود میں پڑی ہوگی!''

میں نے کہا

ذرا دیکھو تو، وہ اس کے پیالے سے منہ لگائے ہوئے ہے اور کل بالکل اسی طرح میرے پیالے سے ہونٹ چپکائے تھی!

اس نے کہا

''اور کل میرے پیالے سے پی رہی ہوگی!''

میں نے پھر کہا

''دیکھو تو اس کی طرف کس پیار سے دیکھ رہی ہے آنکھوں میں سپردگی کا اظہار ہے اور کل بالکل اسی طرح میری طرف دیکھ رہی تھی!''

میرا دوست بولا

''اور کل اسی نظر سے مجھے دیکھے گی!''

میں نے کہا

”کیا تم دیکھ نہیں رہے ہو کہ وہ اس کے کان میں محبت کے گیت گا رہی ہے بالکل وہی گیت جو کل میرے کانوں میں گا رہی تھی!“

میرا دوست بولا

”اور کل یہی گیت میرے کان میں گا رہی ہو گی!“

میں چلایا

”مگر دیکھو تو وہ اس سے بغل گیر ہو رہی ہے اور کل بالکل اسی طرح مجھ سے لپٹی ہوئی تھی“

میرا دوست بولا

”اور کل مجھ سے لپٹی ہو گی“

میں جھلا اٹھا

”یہ کیسی عورت ہے یہ!“

لیکن اس نے کہا

”وہ زندگی ہی کی طرح ہے جس پر سب کا قبضہ ہے اور موت کی طرح وہ ہر ایک کو مسخر کر لیتی ہے اور ابدیت کی طرح ہر ایک کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے!“

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

کفش دوز

موچی کی دوکان پر ایک فلسفی آیا فلسفی کے جوتے پھٹے ہوئے تھے!

فلسفی نے موچی سے کہا

''مہربانی کر کے میرے جوتے مرمت کر دیجیے''

موچی بولا

''معاف فرمائیے ایک تو میں یہ جوڑا سی رہا ہوں دوسرے دو چار مرمت طلب جوڑے ابھی اور باقی ہیں، ان کے بعد آپ کے جوتوں کی باری آئے گی تاہم آپ اپنے جوتے یہاں چھوڑ جائیے اور آج کا دن یہ جوڑا پہن لیجیے کل تشریف لائیے گا اور اپنے جوتے لے جائیے گا!''

موچی کے اس جواب پر فلسفی طیش میں آ گیا!

میں نے کبھی کوئی ایسا جوتا نہیں پہنا جو میرا اپنا نہ ہو

''آپ کہیں فلسفی تو نہیں؟''

موچی اپنے اس استفسار کا کوئی جواب نہ پا کر بولا

''تو آپ یقیناً سچ مچ کے فلسفی معلوم ہوتے ہیں جب ہی کسی دوسرے کے جوتوں سے اپنے پاؤں ڈھانپنا آپ کو گوارا نہیں ہاں تو اسی بازار میں، ایک اور موچی بھی بیٹھا ہے۔ اور وہ فلسفیوں کے مزاج کو مجھ سے بہتر سمجھتا ہے آپ اپنے جوتے کی مرمت کے لئے اسی کے پاس تشریف لے جائیے!''

☆☆☆☆☆

رہبانیت

آج سے بہت پہلے یہاں بہت دور پہاڑوں میں ایک راہب کا مسکن تھا۔ اس کی روح پاک تھی اور ضمیر روشن زمین و آسمان کے تمام جان دار جوق در جوق اس کے حضور میں آتے، اور وہ ان سے باتیں کرتا۔ وہ بڑے انہاک اور شوق سے اس کی باتیں سنتے اور اس کے گرد جمع رہتے یہاں تک کہ سورج ڈھلے وہ انہیں اپنی دعاؤں کے ساتھ جنگل کی ہوا کے سپرد کر دیتا۔

ایک شام جب وہ محبت کے متعلق بات چیت کر رہا تھا تو ایک شیرنی نے اپنا سر اٹھایا اور راہب سے پوچھا۔

’’حضور آپ ہم سے تو محبت کی کہانیاں کہہ رہے ہیں لیکن خود آپ کی اپنی جورو کہاں ہے؟‘‘

راہب بولا

’’میری کوئی جورو نہیں ہے‘‘

اس پر چرندوں، پرندوں، درندوں کے اس انبوہ میں حیرت و استعجاب کی ایک لہر دوڑ گئی، اس کی کوئی نہیں سنتا تھا۔ سب اپنی ہی ہانکتے جاتے تھے قیامت کا شور بے پناہ شور بپا تھا۔

’’یہ ہمیں محبت کرنے کا‘‘

گھر بسانے کا درس کیوں کر دے سکتا ہے۔ جب کہ اس نے خود نہ کبھی محبت کی، نہ کبھی گھر بسایا!

اس نفرت میں وہ اسے اکیلا چھوڑ کر چل دیئے۔

اور رات، راہب چٹائی پر اوندھا پڑا روتا رہا اور اپنا سینہ پیٹتا رہا!

☆☆☆☆☆

ہم اور تم

ہم ابنائے غم ہیں اور تم ابنائے مسرت !

ہم ابنائے غم ہیں اور غم، خدا کا سایہ ہے، جو گنہگار دلوں کے آس پاس اپنا مسکن نہیں بناتا، ہماری روحیں اداس ہیں اور اداسی ایک بلند مرتبہ ہے جو حقیر روحوں کو نہیں ملتا۔

ہم روتے ہیں، نالہ و ماتم کرتے ہیں۔ اے ہنسنے والو! اور جس کسی نے ایک مرتبہ اپنے آنسوؤں سے غسل کرلیا اور ابد الآباد تک کے لئے پاک وصاف ہوگیا۔

تم ہمیں نہیں جانتے لیکن ہم تمہیں جانتے ہیں۔ تم بحر حیات کی طوفان خیز موجوں کے ساتھ چلے جارہے ہوں اور ہمیں پلٹ کر نہیں دیکھتے، لیکن ہم ساحل پر بیٹھے تمہیں بھی دیکھ رہے ہیں اور تمہاری آوازیں بھی سن رہے ہیں، تم ہمارے نالہ وشیون پر کان نہیں دھرتے، اس لئے کہ زمانہ کی چیخ پکار تمہارے کانوں میں گونج رہی ہے لیکن ہم تمہارے نغمے سن رہے ہیں اس لئے کہ رات کی سرگوشیوں نے ہماری سماعت کو تیز کردیا ہے، ہم تمہیں دیکھتے ہیں اس لئے کہ تم تاریک روشنی میں کھڑے ہو۔ لیکن تم ہمیں نہیں دیکھ سکتے۔ اس لئے کہ روشن تاریکی میں بیٹھے ہیں۔

ہم ابنائے غم ہیں، ہم پیغمبر شاعر اور موسیقار ہیں ہم اپنے دل کے تاروں سے دیوتاؤں کے لباس بنتے ہیں اور اپنے سینے کے ٹکڑوں سے فرشتوں کی مٹھیاں بھرتے ہیں۔

اور تم تم مسرتوں کی نیند اور لہو ولعب کی بیداری کی پیداوار ہو، تم اپنے دل دست جہالت کے حوالے کردیتے ہو، اس لئے کہ جہالت کی انگلیاں نرم و نازک ہیں اور نادانی کی قربت سے خوش ہوتے ہو، اس لئے کہ نادانی کا گھر، اس آئینہ سے خالی ہے جس میں تم اپنے چہرہ کا عکس دیکھ سکو۔

ہم آہیں بھرتے ہیں اور ہماری آہوں کے ساتھ، پھولوں کی سرگوشیاں، شاخوں کی

سرسراہٹیں اور آبشار کے نغمے بلند ہوتے ہیں لیکن تم ہنستے ہو اور تمہارے قہقہوں میں کھوپڑیوں کے پسنے کی آواز، بیڑیوں کی جھنکار اور دوزخ کی چیخ و پکار شامل ہوتی ہے۔

ہم روتے ہیں اور ہمارے آنسو، زندگی کے دل میں ٹپکتے ہیں جس طرح شبنم کے قطرے رات کی پلکوں سے صبح کے جگر میں، لیکن تم مسکراتے ہو اور تمہارے تبسم ہونٹوں سے قہر و غضب بہتا ہے جس طرح سانپ کا زہر ڈسے ہوئے آدمی کے زخموں سے۔

ہم روتے ہیں، اس لئے کہ بیواؤں کی مظلومی و بیچارگی اور یتیموں کی بدبختی دے دست و پائی دیکھتے ہیں اور تم ہنستے ہو۔ اس لئے کہ سونے کی چمک کے سوا کچھ نہیں دیکھتے ہم روتے ہیں، اس لئے کہ فقیروں کی کراہ اور مظلوموں کی پکار سنتے ہیں اور تم ہنستے ہو، اس لئے کہ جام و ساغر کی کھنک کے سوا کچھ نہیں سنتے، ہم روتے ہیں اس لئے کہ ہماری روح ذات خداوندی سے الگ ہوکر، جسم میں مقید ہوگئی ہے اور تم ہنستے ہو، اس لئے کہ تمہارے جسم راحت و اطمینان کے ساتھ چمٹے ہوئے ہیں۔

☆☆☆☆☆

ہم ابنائے غم ہیں اور تم ابنائے مسرت!

تو آؤ! ہم اپنے غم کے کارنامے دنیا کے سامنے رکھیں اور تم اپنی مسرت کے اعمال!!

تم نے غلاموں کی کھوپڑیوں سے اہرام تعمیر کئے اور اہرام، ریگ زار میں بیٹھے، قوموں کو تمہاری فنا اور ہماری بقاء کی داستانیں سنا رہے ہیں، لیکن ہم نے آزاد بازوؤں کی قوت سے باستیل کو پاش پاش کیا اور باستیل وہ لفظ ہے جسے قومیں بار بار دہرا کر ہمیں مبارکباد دیتی ہیں اور تم پر لعنت بھیجتی ہیں۔

تم نے کمزوروں کے جسموں پر بابل کے باغ بنائے اور غم زدوں کی قبروں پر نینوا

کے محلوں کی بنیاد رکھی۔ دیکھو! بابل و نینوا مٹ مٹا کر ایسے ہو گئے ہیں جیسے ریگ صحرا پر اونٹ کے پاؤں کے نشانات، لیکن ہم نے سنگ مرمر سے عشروت کی مورتی بنائی اور اس طرح سنگ مرمر جامد ہوتے ہوئے جنبش میں آ گیا اور ساکت ہوتے ہوئے بولنے لگا اور ہم نے ستار پر نہاوند کا راگ چھیڑا اور فضا میں اڑنے والی عاشقوں کی روحیں اس کی طرف کھنچ آئیں۔ ہم نے خطوط والوں کی مدد سے مریم کی تصویر بنائی اور اس طرح خطوط کو دیوتاؤں کے افکار اور رنگ کو فرشتوں کے جذبات کی مثال کر دیا۔

تم لہو و لعب کے پیچھے پڑ گئے جس کے خونخوار پنجوں نے روم اور اطاکیہ کے میدانوں میں سینکڑوں شہیدوں کو چیر پھاڑ کر رکھ دیا۔ اور ہم نے خاموشی سے ناتہ جوڑ لیا۔ جس نے انجیل کے مختلف حصے مرتب کیے۔

تم ناگفتہ خواہشوں کے گلے میں بانہیں ڈال کر سو گئے جن کے تند و تیز جھونکوں نے ہزاروں لاکھوں عورتوں کو ننگ و بدکاری کے جہنم میں جھونک دیا اور ہم تنہائی سے ہم کنار ہو گئے جس کے سایہ میں سبعہ معلقہ، ہملٹ اور دانتے کا قصیدہ وجود میں آئے۔

تم نے حرص و طمع سے دوستی کی جس کی تلواروں نے خون کی ہزاروں ندیاں بہا دیں اور ہم نے تصور کی رفاقت اختیار کی جس کے ہاتھوں نے معرفت کو نور کے بلند دائرہ سے اتارا۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

ہم ابنائے غم ہیں اور ابنائے مسرت اور ہمارے غم اور تمہاری مسرت کے درمیان ایک تنگ و دشوار گزار گھاٹی ہے جس میں تمہارے خوبصورت گھوڑے گزر سکتے ہیں نہ تمہارے چابکدست سوار اسے طے کر سکتے ہیں۔

ہم تمہاری حقارت کو بہ نظر شفقت دیکھتے ہیں لیکن تم ہماری بزرگی سے نفرت کرتے

ہو اور زمانہ ہماری شفقت اور تمہاری نفرت کے درمیان کھڑا ہمیں اور تمہیں حیرت سے دیکھتا ہے!

ہم دوستوں کی طرح تمہارے پاس آتے ہیں اور تم دشمنوں کی طرح ہم پر جھپٹتے ہو اور ہماری دوستی اور تمہاری دشمنی کے درمیان اور آنسوؤں سے بھرا ہوا ایک گہرا غار ہے۔

ہم تمہارے لئے محل بناتے ہیں اور تم ہمارے لئے قبریں کھودتے ہو اور محلوں کی دلکشی اور قبروں کی تاریکی کے درمیان انسانیت فولادی پاؤں سے چلتی ہے۔

ہم تمہار راہوں میں پھولوں کا فرش کرتے ہیں اور تم ہمارے بستروں میں کانٹے بچھاتے ہو اور گلاب کی پتیوں اور کانٹوں کے درمیان حقیقت ابد کی نیند سو رہی ہے۔

ابتدائے آفرینش سے تم اپنی کھردری کمزوری کے ذریعہ ہماری نرم و نازک قوت سے برسرپیکار ہو۔ اگر ایک لمحہ کے لئے ہم پر غالب آ جاتے ہو تو مارے خوشی کے مینڈکوں کی طرح ٹرانے لگتے ہو لیکن ہم تم پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غالب ہیں، دیوتاؤں کی طرح خاموش رہتے ہیں۔

تم نے مسیح ناصری کو سولی پر چڑھایا اور چاروں طرف کھڑے ہو کر اس کا مذاق اڑایا، برا بھلا کہا لیکن جب وہ گھڑی گزر گئی تو وہ صلیب سے اترا اور حق روح کے ساتھ قوموں پر غلبہ پاتے ہوئے اور دنیا کو اپنے حسن و بزرگی سے روشن کرتے ہوئے ایک دیو کی طرح چلا گیا۔

تم نے سقراط کو زہر دیا پال کو سنگسار کیا، **گلیلو** کو موت کے گھاٹ اتارا، علی ابن طالب کو شہید کیا، مدحت پاشا کو پھانسی چڑھایا، اور یہ سب کے سب آج بھی فتح مند بہادروں کی حیثیت سے زندہ ہیں۔ لیکن تم انسانیت کے حافظہ میں ان لاشوں کی طرح زندگی بسر کر رہے ہو، جو خاک پر پڑی ہوں اور جنہیں نیستی و فراموشی کی تاریکیوں میں دفن کرنے والا نہ ملتا ہو۔

ہم ابنائے غم ہیں اور غم وہ بادل ہے جو دنیا میں معرفت اور نیکی کا مینہ برساتا ہے اور تم ابنائے مسرت ہو اور جب کبھی تمہاری مسرتیں بلند ہوتی ہیں۔ دھوئیں کے ان ستونوں کی طرح بلند ہوتی ہیں جنہیں ہوا جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکتی ہے اور عناصر فنا کر دیتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved
2002-2006

عید کی شام

شام ہوئی اور سارے شہر پر تاریکی چھا گئی، عالیشان عمارتیں اور حویلیاں برقی قمقموں سے جگمگا اٹھیں اور لوگ عید کے نئے کپڑوں میں ملبوس سڑکوں پر نکل آئے ان کے چہرے ومسرت و اطمینان سے روشن تھے اور منہ سے شراب و کباب کی بو آ رہی تھی۔

لیکن اس تمام چیخ و پکار اور بھیڑ بھاڑ سے دور یکہ و تنہا، اس شخصیت پر غور کر رہا تھا جس کی یاد میں عید منائی جاتی ہے۔

اس فخر زمانہ کے متعلق سوچ رہا تھا جو غریبی و بیچارگی کے عالم میں پیدا ہوا، زندگی بھر تجربوں سے ہمکنار رہا اور بالآخر سولی پر چڑھا دیا گیا۔

اس آتشیں شعلہ پر اپنی فکر صرف کر رہا تھا جسے دست قدرت نے شام کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں بھڑکایا اور وہ یکے بعد دیگرے مختلف تمدنوں کی مسافت طے کرتے ہوئے زمانے کے اردگرد منڈلانے لگے۔

میں باغ عام میں پہنچا اور ایک لکڑی کی بنچ پر بیٹھ کر بے برگ و بار درختوں میں سے، ان سڑکوں کو دیکھنے لگا، جو آدمیوں سے بھری پڑی تھیں، اور دور سے ان ترانوں کو سننے لگا، جو ایک بے فکر اور پر مسرت جلوس کی شکل میں، عید کی خوشیاں منانے والے اب الاپ رہے تھے۔

ایک گھنٹا اپنے افکار میں گم رہنے کے بعد، میں نے مڑ کر دیکھا، ایک شخص میرے برابر بنچ پر بیٹھا لکڑی سے زمین پر ٹیڑھی سیدھی لکیریں کھینچ رہا تھا میں نے اپنے دل میں کہا

”یہ بھی میری طرح تنہائی پسند معلوم ہوتا ہے۔“

اور اس کے چہرے کو نہایت غور سے دیکھنے لگا۔ پھٹے پرانے کپڑوں اور لمبی لمبی الجھی ہوئی زلفوں کے باوجود اس کے سراپا سے جلال و وقار ٹپک رہا تھا۔

اب اس نے میری طرف دیکھا، اس طرح گویا محسوس کر لیا ہے کہ میں اس کے چہرے اور خدوخال کو نہایت غور سے دیکھ رہا ہوں، عمیق و پرسکون لہجے میں اس نے مجھ سے کہا۔

"شب بخیر!"

"شب بخیر!" میں نے جواب دیا۔

اس کے بعد وہ پھر زمین پر لکیریں کھینچنے لگا اور میں اس کی نغمہ آفریں آواز کے سحر سے تھوڑی دیر مسحور رہ کر پھر اس سے ہم کلام ہوا۔

"کیا آپ اس شہر میں اجنبی ہیں؟"

اس نے جواب دیا

"ہاں اور اسی شہر پر کیا موقف ہے، میں ہر شہر میں اجنبی ہوں"

میں نے کہا

خوشی کے ان موقعوں پر لوگوں میں عام انس و ہمدردی کے جذبات بیدار ہو جاتے ہیں اور اجنبی اپنی تمام تکلیفوں اور پریشانیاں بھول کر کسی قسم کی اجنبیت محسوس نہیں کرتا۔

اس نے جواب دیا۔

"لیکن میں آج کے دن اور دنوں سے زیادہ اجنبی ہوتا ہوں۔"

یہ کہا اور غبار آلود فضا کو دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوئی، اور ہونٹ جنبش میں آ گئے، گویا فضا میں اپنے دور دراز وطن کے نقوش دیکھ رہا ہے۔

میں نے کہا

"ایسے موقعوں پر لوگ ایک دوسرے سے مہربانی کا برتاؤ کرتے ہیں۔ چنانچہ دولت مند فقیر کا خیال رکھتا ہے اور طاقتور کمزور پر رحم کھاتا ہے۔"

اس نے جواب دیا

''ہاں! مگر فقیر کے حال پر دولت مند کا کرم نمود خود پرستی اور کمزور پر طاقتور کی مہربانی اظہار برتری کی ایک صورت ہے اور بس!''

''آپ صحیح فرماتے ہیں!'' میں نے کہا ''لیکن ایک کمزور فقیر کو کیا ضرورت پڑی کہ وہ طاقت ور امیر کے ذہنی میلانات کی چھان بین کرے؟ بھوکا روٹی کا خیال کرتا ہے اس کے متعلق کچھ نہیں سوچتا کہ آٹا کس طرح گوندھا جاتا ہے اور روٹی کس طرح پکائی جاتی ہے؟''

اس نے جواب دیا۔

''لینے والا جب کبھی سوچتا ہے دینے والے کے ہی متعلق سوچتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ وہ سوچے اور ایک مدت تک سوچتا رہے۔''

اس کی یہ بات سن کر مجھے بہت تعجب ہوا اور میں اس کی عجیب وغریب ہیئت اور پھٹے پرانے کپڑوں کے متعلق پھر کچھ سوچنے لگا۔

تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد، میں نے اس کی طرف دیکھا اور کہا

''مجھے آپ ضرورت مند معلوم ہوتے ہیں، اس لئے اگر میں ایک روپیہ آپ کی خدمت میں پیش کروں تو کیا آپ کو قبول فرمالیں گے۔''

اس کے ہونٹوں پر غمگین تبسم نمودار ہوا اور اس نے جواب دیا۔

''میں حاجت مند ضرور ہوں لیکن روپیہ پیسہ کا نہیں!''

میں نے کہا

''آخر پھر آپ کو کیا چاہئے؟''

کہنے لگا[

''مجھے ایک ٹھکانہ چاہئے ایک ایسی جگہ چاہئے جہاں میں دم لے سکوں''

''تو لیجئے!'' میں نے کہا ''یہ دو روپیہ حاضر ہیں کسی سرائے میں جا کر ایک کمرہ کرایہ پر لے لیجئے''

اس نے جواب دیا

میں اس شہر کی ہر سرائے میں گیا لیکن کہیں پناہ کی جگہ نہ ملی، میں نے ہر دروازہ کھٹکھٹایا لیکن کسی کو اپنا دوست نہ پایا میں ہر ہوٹل میں گیا لیکن کسی نے روٹی کا ایک ٹکڑا نہ دیا۔

‘‘کس قدر عجیب ہے یہ انسان! کبھی تو فلسفیوں کی سی باتیں کرتا ہے اور کبھی دیوانوں کی سی’’

لیکن ‘‘دیوانہ’’ کا لفظ ابھی میرے ذہن میں اچھی طرح واضح بھی نہ ہوا تھا، کہ اس نے مجھے گھور کر دیکھا اور پہلے سے بلند آواز میں کہا۔

‘‘ہاں! میں دیوانہ ہوں اور میری طرح ہر وہ شخص دیوانہ ہے جو پردیسی ہے اور اسے کوئی ٹھکانہ میسر نہ ہو جو بھوکا ہو اور اسے روٹی کا ایک ٹکڑا نہ ملتا ہو!’’

میں نے معافی چاہتے ہوئے تلافی کے طور پر کہا

‘‘میری بدگمانیوں کو معاف فرمائیے۔ میں نہیں جانتا آپ کون ہیں؟ آپ کی گفتگو نے مجھے حیرت میں ڈال دیا ہے کیا آپ میری دعوت قبول فرما کر، میرے ہمراہ چلیں گے اور آج کی رات غریب خانہ پر آرام فرمائیں گے؟’’

اس نے جواب دیا

‘‘میں نے ہزار مرتبہ تمہارا دروازہ کھٹکھٹایا لیکن تم نے ایک دفعہ شنوائی نہ کی۔’’

مجھے اس کی دیوانگی کا یقین ہو گیا اور میں نے کہا

‘‘خیر! اب تشریف لے چلئے اور آج کی رات غریب خانہ پر آرام فرمائیے۔’’

سر اٹھا کر اس نے کہا

‘‘اگر تم جانتے کہ میں کون ہوں؟ تو کبھی مجھے دعوت نہ دیتے!’’

‘‘کون ہیں آپ’’ میں نے پوچھا

اتھاہ پانی کی گڑگڑاہٹ سے ملتے جلتے لہجہ میں اس نے جواب دیا؟

میں وہ انقلاب ہوں جو قوموں کی فنا کردہ چیزوں کو پھر سے زندہ کرتا ہے! میں وہ طوفان ہوں، جو زمانہ کے خود ساختہ بتوں کو اکھاڑ پھینکتا ہے۔ میں وہ ہوں جو زمین پر امن و سلامتی کے لئے نہیں قتل و غارت گری کے لئے آیا ہے۔

وہ تن کر کھڑا ہو گیا، اس کا چہرہ چمک اٹھا اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے، اس کی ہتھیلی پر میخوں کے نشانات نمایاں ہوئے میں فوراً اس کے قدموں میں گر پڑا اور چلایا۔

مسیح ناصری!

میں نے سنا، وہ کہہ رہا تھا۔

’’دنیا میرے نام پر عید مناتی ہے، ان رسموں کے زیر اثر، جو زمانہ نے میرے نام کے ارد گرد قائم کر دی ہیں۔ لیکن میں اجنبی ہوں، دنیا کے مشرق و مغرب میں مارا مارا پھرتا ہوں اور کسی گروہ میں کوئی آدمی ایسا نہیں جو میری حقیقت کو پہچانتا ہوں۔ لومڑیوں کے لئے بھٹ ہیں اور پرندوں کے لئے گھونسلے لیکن ابن آدم کے لئے سر چھپانے کی جگہ نہیں۔‘‘

میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ دھوئیں کے ستونوں کے سوا مجھے کچھ نظر نہ آیا نہ ابدیت کی گہرائیوں سے نکلتی ہوئی صدائے شب کے سوا کچھ سنائی دیا۔

☆☆☆☆☆

انسان وقت کا قیدی ہے

طول وطویل دن ختم ہو چکا۔ رات بلندیوں سے جھانک رہی ہے تاکہ بقیہ روشنی کو بھی آہستہ آہستہ جذب کر لے۔

دور جھاڑیوں میں کرمک شب تاب جھلملا رہے ہیں یا کہیں برقی لیمپ کی مدھم سی جھلک نظر آ جاتی ہے۔

ناسازگار موسم کی ہوا سے پتے سوکھ گئے ہیں اور ننھی کلیاں منتشر۔

میری روح پر بے پایاں اداسی چھا رہی ہے ایسی اداسی جو مسرتوں کو اس طرح جذب کر لیتی ہے جیسے اجالے کو اندھیرا نگل جاتا ہے۔

کاش! میں قلبی بے چینیوں اور یوم رفتہ کی یاد کو فراموش کر سکوں۔ نیز ان تلخیوں کو بھی جو گزرا ہوا دن اپنی یادگار کے طور پر چھوڑ گیا ہے۔

چاند کا عکس جھیل کے پانی میں ناچ رہا ہے تارے حسب معمول جگمگا رہے ہیں اور شوریدہ جھونکوں کی چھیڑ چھاڑ جاری ہے۔

وہی ماحول ہے اور وہی فضا! پر میرا دل ناتوانی کے سمندر میں خود بخود ڈوب رہا ہے جیسے احساسات کی باریکیوں کی تاب نہ لا سکتا ہو۔

لیکن آج میں ان تفکرات سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہوں۔ دہر کے آلام کو کچھ دیر کے لئے الوداع کہنے کو تیار ہوں اور یہاں کی کلفتوں کو خیر باد۔

شب کے سائے تاریک تر ہوتے جاتے ہیں اور میرا ارادہ مستحکم! ستارے آسمانی پہنائیوں میں لرزاں ہیں اور میرے افکار فضاؤں میں جنباں! یوم رفتہ آہ!

کاش! میں اس کی شورشوں اور الجھنوں کو بھول سکوں۔ اس کے ترددات اور آلام سے بے نیاز ہو سکوں اور اس کے ہست و بود سے بے پرواہ۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

عہد رفتہ

رات سائیں سائیں کر رہی ہے چاند نے بادلوں میں منہ چھپا لیا اور مست خرام ہوائیں اداس اداس ہیں۔

کائنات کسی گہرے فکر میں ڈوبی ہوئی ہے اور میں عہد رفتہ کے لئے غرق یم خیال

وہ عہد رفتہ! وہ منظر خواب جیسا جمیل عہد!! جب ہر صبح نو اپنے ساتھ مسرتوں کے انبار لاتی تھی جب دیروز ہنگامہ تزئین تھی اور امروز دیباچہ کامرانی

اور فردا! حسین و جمیل فردا! اپنی جملہ رعنائیوں کو اور بھی چمکاتے ہوئے عالم شہود پہ چھا جاتی تھی۔

تب کائنات اک وسیع بربط تھی۔ نشیلے گیتوں کا مجموعہ اور نشاط آفریں نغمات سے معمور

امتداد زمانہ نے اس کے تار ہائے کیف آگیں کو بوسیدہ نہیں کیا تھا اور نہ سالخوردہ دہر کے جھریوں والے ہاتھ اس کے درپے آزاد تھے۔

تب زندگی ایک سہانا سا خواب تھی اپنی تعبیر سے بھی بڑھ کر جمیل خواب!! مرکب بہ کیف و نشاط

حیات کے درد آگین افسانے پر اثر انداز نہیں ہوئے تھے اور نہ اس کی تفسیر مشتمل بر کیفیت چند روزہ معلوم ہوتی تھی۔

لیکن وہ عہد رفتہ! وہ عہد خوش آئند تو اس طرح گزر گیا جیسے موسم بہار کا شباب جب کہ میں شیدا روئے گل دیکھ کر سیر بھی نہیں ہوتی۔

یا جس طرح کف دست ساقی جنبش میں آ جاتا ہے جام عمر بھر پور ہونے سے پیشتر ہی

رات اسی طرح پر سکوت ہے اور چاند بادلوں کی گرفت میں! ہوا کی سرسراہٹ سے دھیرے دھیرے کراہنے کی آواز آ رہی ہے میری روح! میری ناتواں روح عالم

خیال کی وسعتوں میں بھٹک رہی ہے اور عہد رفتہ کی تلاش میں از خود رفتہ

یوں ہی سب تنہائی میں
کچھ دیر پہلے نیند سے
گزری ہوئی دلچسپیاں
بیتے ہوئے دن چین کے
بجھتے ہیں شمع زندگی
اور ڈالتے ہی روشنی
میرے دل صد چاک پہ

☆☆☆☆☆

Iqbal Cyber Library
All rights reserved
2002-2005

افسانہ ہائے ماضیہ

ماضی کے افسانے، یہ نہ بھولنے والی کہانیاں؟ جن سے نا معلوم کس قدر لمحات رنگین وابستہ ہیں اور خواب ہائے جمیل پیوستہ۔

لیکن معبود! حقیقت ہوتے ہوئے بھی یہ پردہ سراب معلوم ہوتے ہیں اور کتاب حیات کے اوراق پارینہ پر اس طرح لرزاں ہیں جیسے کنول کے پھول پر اک قطرہ حباب کانپ رہا ہو۔

ان مٹتے ہوئے حروف میں نہ معلوم کتنے مناظر نگاہوں کے سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں۔

وہ حسین و دلفریب مناظر! جن کی محض یاد ہی اب مقصد حیات ہو کر رہ گئی ہے۔

لیکن آہ کس قدر برق آسا تیزی سے غائب ہو جاتے ہیں۔ محض اپنا نقش پا، یادگار رونق محفل چھوڑتے ہوئے اب چند ہلکے سے نقوش دل کی گہرائیوں میں چھپے رہ جاتے ہیں۔ کبھی کبھی اپنے وجود رفتہ پر توجہ دلانے اور قلب و جگر کو برمانے کے لئے۔

لیکن آہ عمر رفتہ! کہ ان دھندلے سے نقوش کو بھی معدوم کرنے میں کوشاں ہے۔ امتداد زمانہ کے ساتھ صفحہ دل سے محو کرنے کے درپے ہے۔

یہاں تک کہ اک وقت وہ بھی آتا ہے کہ جب ہم اپنے آپ سے سوال کرتے ہیں کہ ان افسانوں کا کبھی وجود بھی تھا یا نہیں؟

لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ ان کی اصلیت محض ''رفت گیا اور بود تھا'' پر مبنی ہے۔ ہم فانی ہیں تو کیا ہوا ہمارے افسانے تو جاودانی ہیں۔

اور جب اجل ہمیں اپنے پراسرار لبادے میں ڈھانپ لیتی ہے تو یہ از سر نو زندہ ہو جاتے ہیں جیسے تشنہ لب زمین سالہا سال کے بعد سیراب ہوئی ہو۔

اس عالم رنگ و بو میں یہ عکس دلفریب بن کر چھا جاتے ہیں اور اپنی حقیقت کو خوشبو کی طرح فضاؤں میں بکھیر دیتے ہیں۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

مریض

خزاں کے دھندلے آسمان پر وہ ہر روز چمکتا۔ اس کی مسکراہٹ ایسی دلفریب تھی کہ ایسا معلوم ہوتا جیسے کائنات دیوار قہقہہ بنی ہوئی ہے۔

کبھی تو وہ نیشکر کی جھاڑیوں کے پیچھے سے نکلتا کبھی سمندری موجوں پر سے آہستہ آہستہ اٹھتا اور کبھی اونچے پہاڑوں کے دامن سے اپنی تابانی دیکھاتا۔

اس کا حسین چہرہ! معبود کیسا تابناک تھا!! اور ضوفشاں!!! کہ میں بے اختیار دیکھے جاتی اور لگاتار دیکھنے کی متمنی رہتی۔

اور پھر وہ دن! جب وہ قمر چہاردہم بن کر چمک رہا تھا، ستارے رعب حسن سے آنکھیں بند کیے ہوئے تھے اور لکہ ہائے ابر اس کے گرد چکر کاٹ رہے تھے۔ جیسے سفید سفید پروں والے فرشتے حفاظت کر رہے ہوں۔

سمندری لہریں سہانے گیت گا رہی تھیں اور چاندنی میں نہائی ہوئی کائنات نگاہ شوق سے تک رہی تھی۔

وہ صانع قدرت کا حسین مرقع تھا اور قلزم حسن کی بے پناہ موج

یہ وقت بھی گزر گیا۔ اب اس کی ضوفشانی کچھ مدھم پڑ گئی تھی اور جگمگاتے ہوئے چہرے پر حسرت کا غلبہ تھا جیسے کوئی پوشیدہ سا غم اسے اندر ہی اندر گھلا رہا ہو۔

اس کی وہ افسردہ نگاہیں اور اڑتی ہوئی رنگت! میں اکثر سوچا کرتی کہ کسی لغزش نے اسے دربار خداوندی میں معتوب کرا دیا ہے۔ آہ! پھر وہ رات!! جب وہ ایک جاں بلب مریض کی طرح سانس لے رہا تھا۔ تلملاتا ہوا دم توڑ رہا تھا اور صد سینہ چاک دہر کو خیر باد کہہ رہا تھا۔

یہ تھا اٹھائیسویں کا چاند جو تخیل شاعر کا موضوع ہے اور اس کے مضطرب دل کا مسکن۔

☆☆☆☆☆

معمار

انطاکیہ میں جہاں دریائے آسی سمندر میں گرتا ہے۔ شہر کے آدھے حصے کو دوسرے آدھے حصے سے ملانے کے لئے ایک پل باندھا گیا!

پل بھاری بھرکم پتھروں سے بنایا گیا۔ جنہیں انطاکیہ کے خچروں میں لود کر پہاڑوں سے لایا گیا تھا۔

جب پل بن کر تیار ہو گیا تو اس کے ایک ستون پر یونانی اور آرامی زبان میں یہ عبارت کھود دی گئی۔

''یہ پل شاہ انطاکیوس دوئم نے بنایا ہے۔''

اب لوگ اس خوبصورت پل سے دریائے آسی کے آر پار آجاتے تھے ایک شام ایک جوان، جسے کچھ لوگ پاگل سمجھتے تھے۔ اس ستون پر چڑھ گیا جہاں وہ عبارت کھدی ہوئی تھی اس نے اسے کوئلے سے مٹا دیا اور اس کی جگہ یہ عبارت لکھ دی!

''اس پل کے لئے پتھر پہاڑوں سے خچر لائے تھے۔ اس پل کو پار کرتے ہوئے تم انطاکیہ کے خچروں کی پیٹھ پر ہوتے ہو یعنی اس پل کے اصل بنانے والوں کی پیٹھ پر!''

اور جب لوگوں نے اس جوان کا کتبہ پڑھا تو بعض تو صرف ہنس دیئے بعض اس کی ذہانت پر حیران ہو گئے اور بعض نے صرف اتنا کہا۔

''ہم جانتے ہیں کہ یہ اس پاگل کا کام ہے جس کے دماغ کے پیچ ذرا ڈھیلے ہو گئے ہیں!''

مگر ایک خچر نے ہنستے ہوئے دوسرے خچر سے کہا

''تمہیں یاد نہیں کیا کہ یہ پتھر ہم نے ڈھوئے تھے''

مگر اس کے باوجود آج تک یہی کہا جاتا رہا ہے۔ کہ یہ پل شاہ انطاکیوس نے بنایا تھا!

-----اختتام-----حصہ اول-----